TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

۴۸۶

ملک کی واحد ادبی مجلس

انجمن ارباب علم پنجاب

کا

ادبی آرگن

ہزار داستان

مرتبہ

سید عابد علی عابدی۔ اے ایل ایل بی — محمد ہادی حسین قریشی بی اے (آنرز)

اعزازی

ڈائرکٹران پبلسی

خان بہادر شیخ عبد القادر بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا، صدر انجمن

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر ایم۔ ایس سی۔ ڈی ایس سی نائب صدر

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی ۔ ۔ ۔ رکن انجمن

بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی ۔ ۔ ۔ سیکرٹری

دار الاشاعت ادب لطیف چیمبرلین روڈ لاہور

نمبر شمار	فہرست اسمائے گرامی حضرات اراکین مجلس ادبا و مجلس انتظامیہ و مربیان	رقم چندہ
۱	ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع ایل ایل ڈی۔ کے۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی۔ ای سرپرست	لعـہ/
۲	خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس انتظامیہ	صہ/
۳	ڈاکٹر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ڈی۔ ایس۔ سی نائب صدر	صہ/
۴	ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا۔ نائب صدر	صہ/
۵	راجہ نریندر ناتھ صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی بیرسٹرایٹ لا۔ صدر مجلس شعراء	صہ
۶	ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی رکن مجلس انتظامیہ	عا/
۷	خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج نائب صدر مجلس شعراء	عہ/
۸	لالہ کشوری موہن متر۔ ایم۔ اے پروفیسر دیال سنگھ کالج نائب صدر مجلس ادباء	عہ/
۹	رائے صاحب لالہ رگھوناتھ سہائے بی۔ اے ہیڈ ماسٹر دیال سنگھ ہائی اسکول رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۰	لالہ گلبہار سنگھ ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۱	شیخ نیاز محمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل رکن مجلس ادباء	عگا/
۱۲	مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس صدر مجلس ادبا	صۂ/
۱۳	سید محمد یحییٰ شاہ صاحب رئیس لاہور۔ رکن مجلس انتظامیہ	صۂ/
۱۴	سردار اودے سنگھ صاحب شائق بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل فیروز پور رکن مجلس انتظامیہ	سے/
۱۵	شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی فائنشل سیکرٹری رکن مجلس انتظامیہ	عہ
۱۶	پنڈت میلا رام صاحب وفا ایڈیٹر اخبار بھیشم رکن مجلس انتظامیہ	عا/
۱۷	شیخ سراج الدین صاحب آذر ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل پروفیسر اسلامیہ کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۸	ابوالمعانی حضرت اختر شیرانی ایڈیٹر انتخاب رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۱۹	مولانا محمود شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج۔ رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۰	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی اسسٹنٹ فارن سیکرٹری کشمیر	عہ/
۲۱	لالہ برج نرائن صاحب ایم۔ اے پروفیسر سناتن دھرم کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۲	مسٹر محمد یوسف خاں سالم بی۔ اے پروفیسر کرسچین کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۳	شیخ عبدالحمید صاحب دلاوری بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل رکن مجلس انتظامیہ	عہ/
۲۴	مولنا تاجور نجیب آبادی سیکرٹری	عہ/
۲۵	مولانا سید اولاد حسین صاحب شاداں لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رکن مجلس انتظامیہ	عہ
۲۶	میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر ہمایوں رکن مجلس انتظامیہ	سے/
۲۷	شیخ نور الہٰی صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس انسپکٹر مدارس لاہور رکن مجلس ادباء	عا/

ہزار داستان

جلد (۸) فہرست مضامین بابت ماہ جنوری ۱۹۲۶ء نمبر (۱)

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ گوپال داس پرنٹر چھپا اور دار الاشاعت ادب لطیف کیلئے محمد اسمعیل لکھیر ملشر و پرنٹر نے چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع کیا)

انجمن اربابِ علم پنجاب کا آرگن

بڑی مسرت سے ہم یہ خبر ناظرین ہزار داستان تک پہنچاتے ہیں کہ ملک کی مشہور علمی مجلس اربابِ علم پنجاب نے ہزار داستان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ ہزار داستان کا یہ نمبر انجمن اربابِ علم کا آرگن بن کر شائع ہو رہا ہے۔ انجمن نے اُردو ادب کا جو اصلاحی پروگرام ملک کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہزار داستان اُسے عملی صورت دیگا۔ آئندہ انجمن کے یادگار ادبی جلسوں کے گرانمایہ مضامین نظم و نثر ہزار داستان کے ہر نمبر میں نظر آئیں گے۔ اس مرتبہ جو تصویر شائع کیجا رہی ہے۔ وہ درحقیقت اُردو نظم کی ایک تاریخی تصویر ہے۔ حضرات اہلِ شملہ نے انجمن اربابِ علم و شملہ میں دعوت دی تھی۔ لاہور سے ملک کے بیس مشہور اہلِ قلم کی ایک قابلِ قدر جماعت انجمن کی جانب سے شملہ گئی تھی۔ وہاں ہز ہائینس آنریبل نواب سر امیر الدین خاں بہادر والیٔ لوہارو اور سردار بہادر سر سندر سنگھ مجیٹھیا سابق ممبر انتظامیہ کونسل پنجاب کی صدارت میں جو انجمن کے جلسے ہُوئے وہ دنیائے اُردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ہندوستان کے ہر طبقہ کے مشہور لیڈر گورنمنٹ کے بڑے بڑے افسر راجے مہاراجے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان جلسوں کے رُوحِ رودان انجمن کے لائف پریزیڈنٹ جناب خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا۔ سابق وزیرِ تعلیم تھے۔ آرمی پریس شملہ میں اُن تمام اہلِ قلم اور سحر طرازوں کا ایک گروپ لیا گیا تھا جنہوں نے انجمن کے جلسوں میں کچھ پڑھا تھا۔ پنڈت کرشن کانت مالویہ ممبر لیجلیٹو اسمبلی بھی اس گروپ میں موجود ہیں۔ خان صاحب چوہدری عبدالحکیم اور مسٹر انعام الحق بی۔ اے انڈر سیکرٹری فارن آفس گورنمنٹ آف انڈیا بھی جو مجلس استقبالیہ کے وائس پریزیڈنٹ اور سیکرٹری تھے۔ اس میں وہ بھی نظر آئینگے۔ خواجہ مسعود احمد انصاری سیکرٹری انجمن اربابِ علم شملہ بھی گروپ میں نمایاں ہیں۔ اُن کا اصل لطف تو دیکھنے والی نگاہوں نے لوٹا ہے۔ لیکن اُن مقتدر ہستیوں سے ہم ناظرین ہزار داستان کو صورت شناس کئے دیتے ہیں جنہوں نے انجمن کے اُن جلسوں کو اُردو کی تاریخ میں یادگار بنایا۔

تاجور سیکرٹری انجمن

قابلِ توجّہ

انجمن کے ممبران مجلس ادبا کی خدمت میں التماس

مجلس ادبا کے تمام ممبران کی خدمت میں ہزار داستان ہر ماہ انجمن کی جانب سے مُفت بھیجا جایا کریگا۔ اور تمام ممبران کے نام ہمیشہ ہر نمبر میں شائع ہوں گے۔ براہِ کرم جن ممبران کے ذمے انجمن کا چندۂ ممبری ہو۔ وہ پہلا نمبر وصول فرماتے ہی اپنا چندہ انجمن کے دفتر میں ارسال فرمائیں۔ کیونکہ ہزار داستان کے ماہوار اخراجات انجمن اسی صورت میں برداشت کر سکتی ہے۔ جب ممبران پوری توجہ سے اپنی ہمدردی کو انجمن کے لیئے بیدار کر دیں۔

آیندہ ماہ بماہ انجمن کے آمد و صرف کی تفصیل ہزار داستان میں شائع ہُوا کریگی۔

ضیاء الدین شمسی فائینشل سیکرٹری انجمن

ANJUMAN ARBAB-E-ILM "SIMLA GROUP."



***1st Row** (**Sitting, from left to right**).* 1. Pandit Krishen Kant Malvi. 2. S. Abid Ali B. A. LL. B. 3. K. B. Sheikh Abdul Qadir. 4. Nafiz. 5. K Dil Mohamed 6. Abhtar

***2nd Row** (**from left to right**).* 1. Hari Chand Sharma. 2. Shammas. 3 K. S. Ch. Abdul Hakim. 4. K. M. Ansari. 5. Inam-ul-Haq 6. Tilok Chand Mehrum. 7. Andleb-i-Shadani. 8. Zia-ud-Din Shamsi. 9 Fakhir Harianwi. 10. Sohan Lal Sahir

***3rd Row** (**from left to right**).* 1. Sec. Army Press. 2. Hasrat. 3. Hairat Delhavi. 4. M. D. Tasir M. A. 5. Uday Singh Shaiq 6. Tajwar. 7. Nazir Ludhianwi. 8. Nayar Bengali. 9. Ch. Manager Army Press. 10. Agha Gul.

The Photo Art Press. Lahore

پنجاب میں اُردو

(ذیل کا مضمون انجمن ارباب علم کے ایک جلسے میں جو خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔ اے بیرسٹرایٹ لاء صدر دائمی انجمن کے زیرِ صدارت منعقد ہُوا تھا، پڑھا گیا تھا، اور اس سے پیشتر کہیں شائع نہیں ہُوا) ایڈیٹر

اگرچہ یہ کہنا درست ہے کہ زبان اظہارِ خیال کا آلہ ہے۔ لیکن زبان کی یہ تعریف جامع و مانع نہیں کی جاسکتی۔ مزاولت سے زبان ذہن کی ترتیب و فکرت کی تدوین کا آلہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو ایسی زبان سکھائی جائے، جو حشو و تنافر۔ خلط مبحث و غرابت۔ ایہام و اجتماع نقیضین۔ طولِ فضول اور اشکال پسندی۔ مبالغہ ضعفِ تالیف سے پاک ہو۔ اور آپ ایسی زبان بولنے اور لکھنے کے عادی ہو جائیں۔ اور آپ کو ایسی زبان میں غور و فکر کرنے کی مہارت ہو جائے۔ تو یقیناً آپ کی فکر مستقیم ہوگی۔ اور آپ کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ جانتے ہیں کہ فکر کی قوت کا وہ درجہ ہے۔ کہ جس تک ترقی کرنے سے التزاماً انسان کا ذہن اتنا صحیح الفکر اور قوی الحرکت۔ وسیع المشاہدات اور سریع المناظرات ہو جاتا ہے۔ کہ پھر اُسے فوراً ضابطوں کے سمجھنے اور نفس نظام کے پہچاننے یعنی اصول قائم کرنے میں دقت پیش نہیں آتی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص فکرت پر تو قدرت رکھتا ہے مگر زبان پر نہیں۔ کیا ایسے موقعے اکثر پیش نہیں آتے۔ کہ ایک شخص آپ سے باتیں کرتے کرتے ایک سوال کے جواب میں بہت کچھ کہکر بھی اپنے کیے پر اعتماد نہیں رکھ سکتا۔ اور بالآخر اُسے اپنے کلام کی خود شرح کرنی پڑتی ہے۔ کہتا ہے۔ "میرا مطلب یہ ہے۔۔۔۔" اگر اس کی ساری تقریر ساتھ ساتھ لکھی جارہی ہو۔ تو واضح ہوگا کہ "میرا مطلب" کے بعد جو کچھ قایں نے کہا۔ بس وہی جواب میں کافی تھا۔ اس سے پہلے کا قول بالکل فضول اور لایعنی تھا۔ میں کہتا ہوں کہ زبان فکرت اور قوائے ذہنی پر بہت کچھ حاوی ہے۔ اور دماغی ترتیب پر اس کا رسوخ اور اثر اس سے کہیں زیادہ ہے جو آ۔ سرسری طور پر خیال کر سکتے ہیں۔

ایک شخص زبان پر اتنی کم قدرت رکھتا ہے کہ

فرض کیجئے۔ لفظ "مردود" کے معنی جانکر بھی اس کے استعمال میں غلطی کرتا ہے۔ اس کا صرف موقع اور محل کے خلاف کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس تخطیہ کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور یہ فقرہ بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے :۔

"جب ابّا مردود شاہی میں چکلہ دار تھے" حضرات سامعین! آپ نے اس قسم کے الفاظ اور فقرے اکثر اشخاص کی زبان سے سُنے ہونگے۔ اور تبسم کیا ہو گا یا اظہارِ نفرت۔ بات یہ ہے کہ زبان فکرت پر حاوی ہو کر قوتِ ارادی کو گویا سلب کر دیتی ہے۔ جس طرح ہکلے کے آلاتِ نطق کا مادی نقص قوتِ ارادی پر غالب آجاتا ہے۔ اور وہ بخلاف ارادہ حروف اور الفاظ کی تکرار کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ کا بے محل استعمال بوجہ مزاولت ایک ذہنی نقص بنکر قوت ارادی کا مزاحم ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ارکانِ تمدن اور تہذیبِ معاشرت بھی زبان کے اثر سے آزاد نہیں یا منطقی صحت کے ساتھ یہ کہیئے۔ کہ ایک جماعت کے خواصِ جمعی اور ایک فرد کے شعار کا موازنہ اس کی زبان کی وضع قطع سے کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ علم لسان کے مبصر زبان ہی کو اس کا مزاج دریافت کرنے کے لئے بمنزلہ نبض کے قرار دیتے ہیں۔ انہیں وجوہ سے اور انہیں امور کو مدِ نظر رکھ کر ادیبوں نے ضابطے باندھے اور قواعد مرتب کئے۔ جن کی تفصیل علم معانی۔ علم بیان اور علم بدیع میں پائی جاتی ہے۔ اور انہیں میں سے چند کا ذکر یہاں بالاجمال کیا جائیگا۔ پیشتر اس کے کہ مَیں چند نکات پیش کروں۔ اس کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ حاشا و کلا میرا یہ زعم نہیں کہ جن نقایص و سقایم کا ذکر ذیل میں آئیگا۔ اُن سے میرا کلام نظم و نثر بالکل پاک ہے۔ بَیں تو کیا جس کسی کو یہ زعم ہو باطل ہے۔ بلکہ آپ یہ سمجھ لیں کہ ان نقایص و سقایم سے بچنے کی فکر ہمیشہ عارضِ حال رہتی ہے۔ لیکن فن اور زبان کے نکات کا اظہار ہر سمجھدار آدمی کا فرض ہے۔ آج کل ہر کہیں جمہوریت کا سکّہ رواں ہے۔ ہماری زبان بھی اس کے معرضِ عمل میں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ جس طرح افراد آزادی اور آوارگی کے معنوں میں حدِ امتیاز قائم کرنے سے عاری ہیں اسی طرح جمہوریت کے معنی بھی غلط فہمی کا شکار بن رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ مَیں اس اصطلاح کو محض ادبی نفسِ معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ شخصیت اور جمہوریت میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ اوّل صورت میں قواعد کی توضیع و تعمیل صرف ایک شخص کو ودیعت ہوتی ہے۔ اور دوسری صورت میں اس ذمہ داری کے لئے چند اشخاص نامزد ہوا کرتے ہیں۔ قواعد یا قوانین اور اُن کی تعمیل و پابندی ہر صورت میں لابدی ٹھہرتی ہے

چونکہ انسان بالطبع متمدّن ہے۔ اس کی زبان بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ضابطہ اور تنظیم کے تحت ہیں ہے لیکن افسوسناک استعجاب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ ایسے اصحاب کی کمی نہیں جو اردو کو جمہوریت کی شان سے بیگانہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس خواہش اور کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معمولی رسالہ یا کتاب کے مضامین سمجھنے کے لئے قاموس اور امرکوشش کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا تو انشا ایسی الجھی ہوئی اور اسلوب اتنا پیچیدہ رکھا جاتا ہے۔ کہ شرح اور تفسیر کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے۔ میری نظر میں یہ آثار اچھے نہیں۔

ادبی۔ تاریخی اور شاعرانہ تحریروں میں غیر مانوس لغات کا استعمال، اللہ بخشے منشی نول کشور کی بدولت عربی فارسی اور ہندی کی ایسی بہت سی کتابیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں۔ جو پہلے اشرفیوں میں مشکل سے ہاتھ لگتی تھیں ہونا یہ چاہیئے تھا کہ علم کے اُن خزانوں کے جواہر اُردو کے زیور میں اس طرح جڑے جاتے۔ کہ اس کی زیب و زینت دوبالا ہو جاتی۔ انگریزی بھی اُردو جیسی غیر حرفی اور تجمیل زبان ہے۔ اس میں لاطینی۔ یونانی اور فرانسیسی وغیرہ زبانوں کے بے شمار لفظ اور ترکیبیں داخل ہیں۔ مگر وہ سموئے ہوئے ہیں۔ نہ تو بے جوڑ اور انمل ہیں۔ اور نہ اس شکل سے کہ سنسکرت اور سقراط۔ ڈڈرو اور دوما سے ماہر ہوئے بغیر سمجھ ہی میں نہ آسکیں بے ضرورت فارسی۔ عربی یا سنسکرت کے لغات کو اُردو زبان برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ ہر لغت کو اصطلاحی حیثیت دیں۔ اور اس کی اصطلاحی اور ادبی شان میں امتیاز نہ کریں، تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ زبان کی توسیع اور ترقی اس طرح ہوگی کہ آپ اسے ان مانوس زبانوں کے اور نیز انگریزی کے اُن ادبی خزانوں سے مالامال کریں۔ جو اُردو کے ظرف میں سما سکتے ہیں۔ اُردو اس ضعیف کی مانند ہے جسے قوت دینے والی اور تازگی بخش غذا کی ضرورت ہے۔ مگر وہ ثقیل اور بطی الہضم نہ ہونی چاہیئے۔ اب اگر اُسے ایسے مقویات اور مفرحات اعتدال سے زیادہ دیئے جائیں تو خوف ہے کہ آلات انہضام ماؤف ہو کر دل کے لئے خون کی کافی مقدار مہیّا نہ کر سکیں۔ جس سے دماغ کے مختل ہونے کا خدشہ ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ زبان کام کا آلہ قرار دی گئی ہے۔ جسکے توسل سے معلومات کی توسیع۔ خیال کی توسیع اور اخلاق و تمدن کی اصلاح مدِّ نظر رکھی جاتی ہے۔ وہ محض تفریح اور دل لگی کی چیز نہیں۔ جب ایک شے اپنے حقیقی مصرف سے گر جاتی ہے تو اس میں طرح طرح کے نقایص آجاتے ہیں۔ آپ ایک گھڑی سے جو اظہار وقت کا آلہ ہے زیور کا کام لینے لگیں تو وہ اپنے حقیقی مصرف

میں قاصر ہو جائیگی۔ آپ چاہینگے وہ چھوٹی ہو، پتلی ہو، ہلکی ہو، اس کا خول سونے کا ہو وغیرہ وغیرہ لیکن صحیح وقت دینے والی گھڑی بھاری ہوگی۔ اس لئے جسامت میں بڑی۔

اسی طرح زبان کا مصرف اگر محض دل بہلانا اور غزل و افسانہ گوئی قرار دیا جائے، تو پھر اس سے کوئی مفید اور اہم کام لینا مشکل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور کام کی بات جو کبھی کہی جاتی ہے لوگوں کے دلوں میں نہیں بیٹھتی

غیر مانوس الاستعمال لغات کلام کو فصاحت سے دُور کھینچ لے جاتے ہیں۔ اور جب ایک کلام فصاحت سے دُور ہو جائے تو تاثیر سے بھی محروم ہو جاتا ہے کلام فصیح کی تعریف علم معانی میں یہ آئی ہے۔ کہ کلام فصیح وہ کلام ہے جو غرابت۔ تنافر حروف۔ مخالفت قیاس لغوی اور عیبِ ترکیب سے پاک ہو۔ ایسا کلام اگر امر حق اور پاکیزہ خیالات پر محتوی ہو، تو سامع پر ضرور اثر کریگا لیکن اگر وہ کلام فصیح نہیں تو اس کا اثر سامعین یا ناظرین کے دلوں پر جیسا کہ مقصود ہے ہرگز نہ ہوگا۔

غرابت کی تعریف میں اُوپر بتا آیا ہوں، یعنی کلمہ غیر مانوس الاستعمال کلام میں لانا مثلاً ریل کی جگہ سکۃ الحدید۔ شذرات۔ ملاحظات۔ استبداد۔ احتجاج حرّیت۔ بیاگرنی۔ ڈیفینیشن۔ ڈیپارٹمنٹ۔ آدرشیہ۔ آدرش۔ دکولوں۔ آندولن وغیرہ وغیرہ مصنّفین اور اہلِ قلم کے کلام سے صفحہ اور سطر کی قید کے ساتھ نظیریں پیش کیجا سکتی ہیں۔ لیکن مذاقِ سلیم مانع ہے۔ کہ مبادا ایراد و تعریض کے الزام کا مورد ہو جاؤں۔

غرابت کے بعد ہی مخالفت قیاس لغوی کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تعریف ہے فارسی یا اُردو کے ضابطہ کے خلاف کوئی لفظ کلام میں وارد کرنا۔ جیسے ع

سودا میں اس چمن میں ہوں جوں غنچہ دل گرفت

اس مصرعہ میں دل گرفت ضابطہ فارسی کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ دل گرفتہ کہنا چاہیئے۔

موسےٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعوں کو تُو نے غرق کیا رودِ نیل کا

یہاں "رودِ نیل کا" خلافِ ضابطہ اردو استعمال کیا گیا ہے۔ اُردو کے ضابطہ کے مطابق "رودِ نیل میں" ہونا چاہیئے۔

یہ دو نقایص کلام کے اور سب نقایص سے کہیں زیادہ عام ہیں۔ اور اُردو کی اکثر تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ مقامی اور ذاتی تخصیص کا اِس میں دخل نہیں۔ لوگوں کا مذاق کچھ ایسا بگڑ گیا ہے کہ بےضرورت اور بے محل کلام میں غیر مانوس لغات عربی۔ فارسی اور سنسکرت کے ٹھونسے جاتے ہیں۔ اگر پنڈتائی اور مولویت

کا زعم ذہن شریف پر ایسا ہی مسلط ہو گیا ہے۔ تو عربی، فارسی اور سنسکرت میں خامہ فرسائی کیوں نہیں فرمائی جاتی؟ بیچاری اُردو کے گلے پر شمشیرِ اصفہانی اور فولادِ ہندی کیوں لادی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اور بات ذکر کے قابل ہے۔ جو نہایت عجیب ہے۔ یعنی مشاق اہلِ قلم اور مصنف خاص کر ایسے موقع پر جس کی اہمیت اعلےٰ درجے کی ہو اپنے قلم پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یا تو ایک عندیہ کو جو اصطلاحی حیثیت رکھتا ہو۔ ایک ہی تحریر میں ایک سے زیادہ الفاظ میں تعبیر کرینگے۔ جیسے ۱۹۱۸ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کے استقبالی خطبہ ایڈریس کے لئے دو جگہ دو مختلف لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی حلیفی اور اتحادی۔ یا یہ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ایک تحریر ایک عالم فاضل سے لیکر گنوار کسان تک کیلئے مقصود ہو۔ لیکن ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔ کہ ان کی تشریح کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایک لفظ کے لئے کئی کئی الفاظ خطوطِ وحدانی بطور تلویح لکھنے کی ضرورت عاید ہوتی ہے۔ اس کی نظیر میں پنجاب کی پچھلی انڈین نیشنل کانگریس کے استقبالی خطبہ سے چند الفاظ اور فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "محبت کی مے میں سرشار ہو کر" مے اور سرشار کو بدل کر اگر یوں کہتے "محبت کے نشہ میں چور ہو کر" تو پڑھے اور بن پڑھے سب سمجھ جاتے۔ دھیریہ لکھ کر خطوطِ وحدانی میں (استقلال)

لکھا گیا ہے۔ اسی طرح "نربھتا" کی تشریح "(بے خوفی)" سے کی گئی ہے۔

یہاں ایک اور نظیر بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ جو مخالفت قیاس لغوی کی ذیل میں آتی ہے ۱۹۱۹ء کے اپریل اور مئی کے مہینوں میں لاہور میں مارشل لا۔ یعنی فوجی حکومت کا دَور رہا۔ مارشل لا۔ کے افسر نے متعدد احکام رعایائے شہر کی آگاہی اور تعمیل کے لئے نافذ کئے۔ یہ احکام انگریزی اور اُردو وغیرہ کئی زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔ انگریزی میں تو ان احکام کا ہمیشہ ایک ہی عنوان ہوتا تھا (مارشل لا۔ آرڈر نمبر..........) لیکن اُردو میں کوئی التزام ان تین لفظوں سے مرکب عنوان کا نہ بن پڑا۔ چنانچہ کم سے کم تین مختلف ترجمے ایسے احکام کے ایک ہی عنوان کے کئے گئے۔ حالانکہ اس کی حیثیت ٹھیٹھ اصطلاحی تھی۔ ملاحظہ ہو:-

(۱) "اعلان فوجی قانون نمبر ۲۲"

(۲) "اعلان ـ فوجی قانون نمبر ۲۰"

(۳) "فوجی قانون حکم نمبر ۱۹"

حالانکہ یہ ترجمے پلٹن کے سپاہیوں یا نیم تعلیم یافتہ انگریز افسروں نے نہیں کئے تھے۔ بلکہ ایک سرکاری دفتر کے ان اہل قلم اصحاب نے جن کا کام ہی تالیف اور ترجمہ تھا۔ اب دیکھئے ان تینوں عنوانوں کے اگر بروئے قواعدِ

زبانِ اردو کچھ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ تو وہ مختلف فیہا ہیں۔
"اعلان فوجی قانون نمبر ۲۲" سے یہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح ہائیکورٹ کے فیصلے یا فنانشل کمشنر کے سرکلر مختلف نمبروں میں نکلا کرتے ہیں۔ اسی طرح اہالیانِ فوج سے متعلق جو قوانین افسرِ مجاز وقتاً فوقتاً جاری کرتا رہا۔ یہ اس کے ایک نمبر کا اشتہار ہے۔

دوسرے عنوان میں اعلان کے بعد جو ایک لمبا موٹا خط گھسیٹا گیا ہے۔ اس کی ہستی کو اُردو کے فنِ انشا کے ضابطہ میں تسلیم کر بھی لیا جائے تاہم اس کلام کے کچھ معنی قرار نہیں دئے جا سکتے۔

تیسرا عنوان فوجی قانون حکم۔ یہ قطعاً مہمل ہے۔ اس لئے کہ یہ تینوں الفاظ الگ الگ اگرچہ اپنے معنی رکھتے ہیں اور انہیں کلمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن قواعد زبان اُردو کے بموجب ترکیب بالاسناد سے معرّا ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعۂ الفاظ مہمل قرار پاتا ہے۔

مخالفتِ قیاسِ لغوی کی تحت میں چونکہ ترجمہ کا ذکر آگیا ہے۔ تو یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ استعمال نے یورپ کی زبانوں کے بہت سے کلموں کو کلام میں ایسا مروج کر دیا ہے اور کان ان سے اسقدر آشنا ہو گئے ہیں کہ اب ان کی جگہ سنسکرت یا عربی۔ فارسی کے لغات لانا یا گھڑ کر رکھنا سامعہ کو گوارا نہیں ہوتا۔ اور ایک قسم کا

مخالفت قیاس لغوی کا نقص وارد کرتا ہے۔ آزاد مرحوم نے ایک لمبی فہرست ایسے الفاظ کی مرتب کی تھی لیکن اب وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ ابھی تھوڑی مدت گزری کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تنظیم کی ذیل میں اصطلاحات علوم طبیعات کے متعلق حیدرآباد میں بڑی بحث ہوئی۔ ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر طباطبائی حیدر یار جنگ تھے۔ آپ باوجودیکہ عربی اور فارسی کے جیّد عالم ہیں۔ لیکن آپ کا قول یہ تھا۔ کہ اگر ایک لغت انگریزی کا ایک شے کے لئے معین ہے تو اس کو اُردو میں استعمال کرنا بہتر ہے۔ بمقابلہ اس کے کہ عربی کا ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے۔

سب جانتے ہیں کہ جب کسی جماعت میں بیداری کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ تو ہر چیز دینا اور قومی رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ مصوری۔ موسیقی۔ شاعری۔ ڈراما۔ تعمیر وغیرہ بھی آئینِ حکومت کی اصلاح اور اخلاق جمہور کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قومی رنگ پکڑتے جاتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ اور باتوں میں بھی آزادی آتی جاتی ہے۔ لیکن یہ آزادی سیاسی ہو یا کسی اور نوع کی اخذ و ترک۔ کسب اور جلب منفعت۔ ضابطہ اور معقولیت پر موقوف ہونی چاہیئے تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ دُنیا میں وہی قوم پروان چڑھی، جس کا دستور العمل اس شعر کی مصداق

کھا ۔ ۵

تتبع زہر گوشہ یافتم
زہر خرمنے خوشہ یافتم

دُنیا کی اعلےٰ درجے کی مقتدر اور متمدن اقوام میں سے دو کے ساتھ ہم کو خصوصیت ہے۔ جاپان اور انگلستان جاپان کے ساتھ اس بنا پر کہ وہ ہمارا ایشیائی بھائی ہے اور انگلستان سے اس لئے کہ وہ ہمارا حاکم ہے۔ جاپان کی ترقی کل کی بات ہے۔ اور انگلستان کی بیداری صرف سولھویں صدی عیسوی کے وسط سے عرصۂ شہود میں آئی جسے کم وبیش تین سو برس ہوتے ہیں۔ ان دونوں قوموں کی اور ترقیات کے دفاتر کو جانے دو۔ اور صرف ایک ایک لغت کی کتاب اُٹھالو تو واضح ہوگا کہ غیر زبانوں کے کتنے خیالات الفاظ اور ترکیبیں انہوں نے اپنے ہاں لے لئے اور ان کو اپنے ذہن اور زبان کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اگر اہل ہند بیدار ہونے لگے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ زبان سے نادار ہوجائیں ہندی والوں نے بڑی دانائی کی کہ پنڈتوں کی ایک نہ مانی۔ اور یورپی زبانوں کے بہت سے اصطلاحی لغت یا ترکیبات جن کی آواز کانوں کو ناگوار نہ تھی اور جن کا بدل غیر مانوس سنسکرت کا لغت یا فقرہ تھا۔ جوں کے توں یا خفیف پھیر بدل کے ساتھ اپنی علمی فرہنگ میں داخل کر لئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو ہندی سائنٹیفک گلاسری۔ مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس) اس اصول پر مولانا طباطبائی عثمانیہ یونیورسٹی کو چلانا چاہتے تھے۔ زبان کے باب میں ہندی والوں کی اہلیت قابلِ داد ہے۔ اور تقلید کی مستحق۔ تلک مرحوم کی گیتا رہس کا ہندی ترجمہ رائپور واقع صوبجات متوسط کے مسٹر مادھو راؤ سپرے نے کیا۔ اور ایسی زبان میں کیا۔ کہ ہر ہندی خوان جو سنسکرت نہیں جانتا اسے بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ایک باب میں یہ فارسی اور عربی الفاظ کوئی پچاس صفحوں کے حجم میں میری نظر سے گزرے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

روزگار (یعنی شغل جو وجہ معاش ہو) طرح۔ طور۔ موقع۔ معلوم۔ ایک بار۔ پروا۔ دلیلیں پیش کرنا۔ بعد۔ علاقہ۔ سوار۔ ایک دم۔ ارادہ۔ جاری۔ بالکل۔ زور شور۔ حال۔ حال ہی میں۔ تیار۔ درمیان۔ مینار۔ عمارت۔ زمین۔ حساب۔ دربار۔ ضرور۔ حیثیت۔ صرف۔ نمونہ صدی۔ دلیلیں۔ دیر۔ یعنی۔ اصل میں۔ حصّہ۔ سلسلہ۔ صاف صاف۔ وغیرہ۔"

اگر میں ان الفاظ کے سنسکرت مترادف سنانے بیٹھوں، تو آپ میں سے اکثر اصحاب ابھی جمائیاں لینے لگیں۔ نہیں تو کھانسی ضرور چھوٹ پڑے! اسے کہتے ہیں ادبی رواداری۔ اور تاج تبلیغ۔ ہمارے ہاں انشا پردازی کی معراج یہ سمجھتے ہیں کہ لکھنے والے کو بڑا عالم اور لکھا پڑھا

سمجھا جائے۔ یہ سوچے کسی کی جوتی کہ جو کچھ لکھا ہے اس کے سمجھنے والے کتنے ہونگے۔ اخبار کو جریدہ - روزانہ کو روزنامہ - رسالہ کو مجلہ قس علی ہذا لکھ کر اپنے زعم میں اپنے آپ کو ظہوری اور بدر چاچ کی ٹکر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اڈیٹر تو مدیر کے ساتھ مدیر یا گڑگڑانے جمپت ہوتا۔ اب رئیس التحریر کا من مانا خطاب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک رئیس التحریر ملاحظات کی ذیل میں فرماتے ہیں۔

"گزشتہ دسمبر سے ---- برابر چھ جزو پر نکل رہا ہے۔ لیکن میری یہ جرأت صرف اس توقع پر تھی۔ کہ موجودہ خریداران میں سے ہر صاحب کم از کم ایک خریدار ضرور پیدا کر دینگے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی تاہم میں مایوس نہیں ہوں۔ اور فروری کا رسالہ پھر چھ جزو پر شائع کر رہا ہوں۔ یعنی میں اپنی توقعات کو پھر باندازہ یک ماہ وسیع کرنا چاہتا ہوں۔ قدم بڑھا کر پھر اس کو لوٹانا میری فطرت کے خلاف ہے۔ لیکن اگر آپ نے اعانت نہ فرمائی، تو مجبور ہو کر مجھے یہ بھی کرنا پڑیگا۔ اور رسالہ پھر ۸۰ صفحات کا کر دیا جائیگا - - - - - - - - - -

"میں طبعی مشورہ کی بنا پر فروری اور مارچ ---- سے باہر بسر کرنے پر مجبور ہوں۔ ہر چند ڈاک برابر مجھے ملتی رہیگی۔ تاہم ممکن ہے کہ تمام خطوط کا جواب بروقت نہ دے سکوں۔ اس لئے قبل سے یہ معذرت پیش کئے دیتا ہوں۔"

اس نثر کے ابتدائی حصہ میں تین جگہ "لیکن" آیا ہے۔ دو مقام پر یہ کلمہ محض حشو ہے۔ "یعنی" اور اسکے بعد جو کچھ درج ہے۔ وہ بھی بے ضرورت ہے۔ دونوں "تاہم" اور "ہر چند" بھی غیر ضروری ہیں۔ یہ سارا مطلب فصیح اور سلیس اُردو میں اس طرح لکھا جا سکتا ہے:۔

پچھلے دسمبر سے ---- برابر چھ جز پر نکل رہا ہے۔ میری یہ جرأت صرف اس توقع پر تھی کہ ---- کے موجودہ قدردان ایک ایک خریدار تو ضرور پیدا کر دینگے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ مگر میں مایوس نہیں اور فروری کا رسالہ پھر چھ جزو پر نکال رہا ہوں۔ قدم بڑھا کر لوٹانا اپنا شعار نہیں۔ اس پر بھی آپ نے اعانت نہ فرمائی تو پھر میں مجبور ہو جاؤنگا۔ کہ رسالہ کو ۸۰ صفحات پر لے آؤں۔ - - - - - - - - -

میں طبی مشورہ سے فروری اور مارچ میں ---- سے باہر رہونگا۔ ڈاک تو مجھے ملتی رہیگی۔ لیکن شاید سب خطوں کے جواب فوراً نہ دے سکوں۔ اس لئے پہلے سے یہ معذرت پیش کرتا ہوں۔

اسی رسالہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "اوائل ہفتہ ہم صدی میں" اگر سترھویں صدی کے اوائل میں لکھ دیتے، تو کیا اُردو کی تیرھویں ہو جانے کی بدشگونی تھی۔ بقولیکہ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شوکت الفاظ بلند آہنگی اور نور کلام کا مفہوم غلط قرار دیا گیا ہے۔ شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ بلاغت اور کلام بلیغ اسی کا نام ہے۔ بلاغت یا کلام بلیغ کی تعریف ادیبوں نے یہ کی ہے۔ کہ ایسا کلام جس میں فصاحت اور مقتضائے حال کی موافقت پائی جائے۔ کلام بلیغ ہے کلام کے اسی وصف کو بلاغت کہتے ہیں۔

نثر لکھیں یا نظم انشا کو غریب اور خلاف قیاس لغات اور ترکیبوں سے گرانبار کر کے بلند آہنگی کا خون کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو تشبیہ اور استعاروں کی وہ بھرمار کر دی جاتی ہے۔ کہ الہیٰ توبہ۔ سب مانتے ہیں کہ مرزا غالب نے ان دو صنعتوں کی مدد سے باریک نکتے شاعری کے اپنے کلام میں داخل کئے لیکن ان کے ہاں بھی ان کی بہتات سے تغزل کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور یہی نہیں کہ کلام نغز گفتاری سے دور ہو گیا۔ بلکہ مغلق ہو گیا۔ چنانچہ اپنے ارشد تلامذہ اور اہل مذاق احباب کے استفسار پر کبھی کبھی خود ان کو اپنے اشعار کی شرح کرنی پڑی۔ مرزا کا تتبع آجکل اردو نظم کے طبقۂ جدید میں ساری و حادی ہے۔ تتبع کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ مرزا کو بھی یہ رنگ اعتدال سے خارج محسوس ہوا۔ اور آخر کو چھوڑ دینا پڑا۔ انہوں نے اواخر عمر میں اپنے ممدوح میر تقی کی طرف مراجعت کی۔ اور وہ اسی رنگ کے اشعار ہیں۔

جنہوں نے خلقت کو ان کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ پہلے فرمایا کرتے تھے :-

سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ برخوردار بستر ہے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

اہل بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہر آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

پھر فرمانے لگے :-

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھینگے جواب میں

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

دیکھ کر ان کو جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آزاد مرحوم نے تشبیہ و استعارہ کے استعمال کے باب میں جو تاکید کی ہے۔ نہایت اہم اور لازمی ہے۔ آپ

آب حیات میں فرماتے ہیں :-

"ہمارے متاخرین کو آفرین لینے کی آرزو ہوتی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صنعت در صنعت کبھی استعارہ در استعارہ سے تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہوگئی۔ کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہئے۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

"اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ اُنہوں نے ایک قُدرتی پھُول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے کھلتا تھا مفت ہاتھ سے پھینک دیا وہ کیا ہے ؟ کلام کا اثر۔ اور اظہارِ اصلیت۔ ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔"

جاننا چاہئے کہ انسان کا نفس عقلی کی نسبت حسی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اور لطف سخن کی بنیاد محاکات پر ہے۔ اس لئے تشبیہ کو علم بیان میں جگہ دی گئی لیکن لکھنے والوں کو احتیاط چاہئے۔ کہ تشبیہیں اور استعارے کلام میں اسی قدر آئیں جسقدر کھانے میں نمک مسالہ۔ نہ کہ نمک مسالہ میں کھانا۔ تشبیہہ کی بنیاد اگرچہ غواصی پسندی۔ معنی آفرینی اور جدت طرازی اور تحسین کلام بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس کی علتِ غائی فصور اظہارِ حقیقت ہے۔ ذیل کی تاریخی مثال سے اس کی وضاحت ہوگی۔

لکھا ہے کہ حسّان ابن ثابت کے چھوٹے بچے کو ایک دفعہ بھڑ نے کاٹ کھایا۔ چہرہ پر ورم ہو گیا۔ حسّان کو خبر ہوئی۔ لڑکے سے پوچھا کس جانور نے کاٹا لڑکا جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ یہ حقیقت اس پر ظاہر نہ تھی۔ کہ جس جانور نے اسے کاٹا اس کو زنبور کہتے ہیں پھر حسّان نے پوچھا کہ وہ کس قطع کا جانور تھا۔ بچہ بے تکلف کہنے لگا۔ "کانہ ملتفا حبرہ" یعنی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ دھاریدار چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ بھڑوں کے پروں پر رنگین خط ہوتے ہیں۔ اس لئے انکو دھاریدار چادر سے تشبیہ دی۔ حسّان سمجھ گیا کہ بھڑ نے کاٹا تھا۔

پچھلے چالیس برسوں میں بیشمار ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوئے۔ اس سے جہاں یہ ہوا کہ انگریزی مصنّفوں کے خیالات سے اُردو مالامال ہوئی۔ یہ بھی ہوا۔ کہ اس کی انشا کی پرداز بگڑ گئی۔ بیان کا اسلوب پیچیدہ اور مغلق ہوگیا۔ اس کا الزام نہ صرف انگریزی داں اُردو نویسوں پر ہے۔ بلکہ ان پر بھی جو انگریزی جانتے ہی نہیں۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جو خیال دو تین چھوٹے چھوٹے جملوں میں سلاست سے ادا ہو سکتا تھا۔ گھیر گھوٹ کر ایک

لمبے اور پیچیدہ جملے میں الجھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایسے جملے تازہ تصانیف اور رسالوں میں اکثر پائے جاتے ہیں:-

"انسان جبکہ مسلّم طور پر اشرف المخلوقات مانا گیا ہے تو چاہئے تھا کہ وہ اپنے حسیات و جذبات پر پورے طور پر قادر ہوتا جیسا کہ ایک کل انجن اپنے مختلف پرزوں کے افعال و حرکات پر قادر ہوتا ہے۔ جبکہ ان میں سے ہر ایک کا فعل جدا گانہ ہے۔ جن کی رفتار کو حدِ اعتدال کے اندر رکھنا اس کا فرض ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی اپنے پایہ سے گر جاتا ہے۔ جو آخر کار اسے گراتے گراتے بہایم میں ملا دیتا ہے۔ جن سے تمیز کرنے کو قدرت نے اسے عقلِ سلیم عطا فرمائی تھی۔ جو نورِ سبحانی اور دلیلِ راہ حقیقت بتاتی ہے۔ جیسا کہ علمار حکمار نے کہا ہے جن کے علم و فضل کے اکناف عالم میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ اور جنہیں اُستاد خلاّق مانا جاتا ہے۔ خواہ ان کے تمام خیالات سے ہمیں اتفاق ہو یا نہ ہو۔"

اب دیکھئے یہ عبارت غرابت اور مخالفت قیاس لغوی کی تعریف سے باہر ہے لیکن کلمے اگرچہ بالا سناد ترکیب رکھتے ہیں۔ ان کی نشست اور اسلوب ذہن سے

ناآشنا واقع ہوئے ہیں۔ یعنی یہ عبارت باوجود اُردو زبان کی ہونے کے اُردو کی سی نہیں جنچتی۔ متکلم کا مافی الضمیر چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں آسانی اور خوش اسلوبی سے ادا ہو سکتا تھا۔ میاں بشیر احمد صاحب اور مولانا تاجور صاحب نے اُردو پر بڑا احسان کیا کہ اپنے رسالہ ہمایوں میں اُردو کے متعلق انعامی مضامین کا اعلان کیا۔ جو مضامین اس اعلان کے جواب میں لکھے گئے وہ ہمایوں میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے صرف دو مضامین کی طرف اشارہ کیا جائیگا۔ مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ہندی اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اُردو زبان کے تیار کرنے میں ان دونوں زبانوں نے کام کیا ہے۔ عربی ایک دوسرے خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کو سامی خاندان کہتے ہیں اگر ہم اُردو کے ان الفاظ کو شمار کریں جو ہندی اور فارسی سے لئے گئے ہیں۔ تو بمقابلہ عربی زبان کے الفاظ کے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ الفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری زبان میں آریائی الفاظ اور سامی الفاظ کے درمیان میں چھ اور ایک کی نسبت ہے۔ اُردو زبان کی قدرتی ساخت آریائی ہے۔ کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی زبانوں کی مشترک گرامر ہے۔ عربی کے الفاظ بے شبہ

اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ مگر ان سے اس زبان کی قدرتی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ اُردو گرامر کو عربی گرامر سے کوئی واسطہ نہیں۔"

"جو اُردو زبان کا موجودہ ادب عربی ایرانی ادب کی نقل ہے یعنی اس ادب کی نقل کی گئی ہے جو عرب اور ایران کے متحد اثر سے تیار ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی جھلک نام کو نہیں۔"

اسی موضوع پر حضرت ناظر دہلوی اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

"زبان کو سہل بنانا دراصل اس کو ترقی دینا ہے جو لوگ مغلق ترکیبیں اور ادق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ دیدہ و دانستہ اُردو کے دشمن ہیں۔"

مَیں اب اور اقتباس نہیں کرونگا۔ تاکہ طوالت سے بچوں۔ اس قبیل کے مضامین کو مارچ ۱۹۲۳ء کے ہمایوں میں تمام و کمال پڑھنا اور ان پر غور و فکر کرنا اردو کے ہر خیر خواہ کا فرض ہے۔

پروفیسر سلیم نے اپنے مضمون میں جس کا ابھی ذکر کر آیا ہوں، ایک نئی آنے والی قوم کی بشارت دی ہے۔ فرماتے ہیں۔ "اس آنے والی قوم کا نام ہندلمان ہوگا۔" ایسی قوم کا یہاں کبھی ظہور ہوگا یا نہیں۔ اسے تو خلاق دو جہاں کی قدرت صانعہ پر چھوڑئیے، بالفعل اس پر غور کیجئے کہ اردو میں ہندلمانیت جو بزرگ پیدا کر گئے ہیں اسے تو نہ مرنے دیں۔ اُردو کے سچے خیر خواہوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ملک کے دیسی لواحقات۔ تلازمے۔ محاکات۔ روایتیں اور کہاوتیں جن سے متقدمین اردو زبان کو سجایا کرتے تھے۔ اور جن کا تتبع متاخرین نے بھی کیا۔ اب ہم نے زبان سے ان کے خارج کر دینے کی قسم کھائی ہے۔

سُنئے سلف کیا فرما گئے ہیں۔

گردش سے روسیہ کی کیا کیا بلائیں آئیں
میرؔ: جانے ہی کے ہیں لچھن سارے اس آسماں کے

ریگستاں میں جاکے رہے یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہاں بسرام کیا

دل کی تہ کی کسی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت
انچھر تو ہیں عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

شعلہ پیرا اگر ہو تیری تیغ
سوداؔ: کاہ سے کوہ تک ہو سب بھسمنت

شاید آجائے کبھی ہاتھ عروس گیتی
جرأتؔ: اسی امید پہ ہم بیٹھے ہیں آسن مارے

دل بھی اب تجھ سے دُور بھاگے ہے
اس سے مل کر اسے بھی بھاگ لگے

مصحفی: چہرہ اُتر گیا ہے نقشے بگڑ گئے ہیں
پھر ان دنوں تو میرے لچھن سے بھڑ گئے ہیں

رنگین: ہے یہ گھر لنکا یہاں ہے کوئی باون گز سے کم؟
ایک سے ایک آہ بندی کی سہیلی تھر ہے

نصیر: تیرے ہی نام کی سمرن ہے مجھ کو اور تسبیح
تو ہی ہے ورد ہر اک صبح و شام عاشق کا

معروف: غیر ہفتہ کے دن آیا جو سفر سے معروف
میں نے جانا کہ بس اب مجھ پہ سنیچر آیا

ناسخ: دیکھا جسے ہو گیا وہ عاشق
تیری آنکھوں میں موہنی ہے

ذوق: گر رُخ کا بوسہ دینے نہیں لب کا دیجئے
وہ ہی مثل ہے پھول نہیں پنکھڑی سہی

آتش: ارادہ عرش اعظم کا ہے آہ صبحگاہی کو
در فرہاد رس پر چل کے اب دھونی رمانی ہے

اسیر: چاہے قسم جو یار تو کیا کیا اُٹھائیے
قرآن سر سے آنکھ سے گنگا اُٹھائیے

ہم تو پیاسے رہے مے غیر کو دی پیر مغاں
اُلٹی اس شہر میں بہتی ہوئی گنگا دیکھی

رند: نہ دلا یاد او تسلسل اشک سمرنی یار کی کلائی کی

وزیر: اس بت کافر کا زاہد نے بھی نام ایسا جپا
دانۂ تسبیح ہر اک رام دانہ ہو گیا

بحر: ہے کچھ نہ کچھ تو بجوگ ناحق نہیں یہ بروگ
کیسا لگا جی کو روگ اے بحر کیا حال ہے

طرّۂ حسن اس صنم کے سر پہ زیبا ہو گیا
زلف کالی بن گئی۔ جوڑا کنھیا ہو گیا

ہوا دھوپ میں بھی نہ کم حسن یار
کنھیا بنا وہ جو سنولا گیا

کب شعر ہم نے یار کے آگے پڑھے نہیں
کس دن ہمارے پھول مہیسر چڑھے نہیں

آپ نے دیکھا کہ متقدمین و متاخرین اُردو کیا کیا محاورے تلمیحات اور محاکات جو ٹھیٹھ ہندوستانی کیا معنی ہندوانی ہیں۔ اپنے کلام میں لاتے تھے۔ اور پھر کس صحت کے ساتھ اور برمحل۔ مرزا رفیع سودا کے ہاں کئی مرثیے ہندی آمیز اُردو میں ہیں۔ اور دوہے چوپائی میں ہیں۔ اور پھر یہ سب بزرگ جن کے کلام سے ابھی استفادہ کیا گیا مسلمان تھے۔ بلکہ ان کی شان میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ "ہندلسان" تھے۔ اور ان کا وطن مُلک سخن تھا۔

میرے محترم دوست حضرت صدر جلسہ[1] مخزن مرحوم کے سرورق پر لکھا کرتے تھے۔ "دو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں۔" آجکل کی میعادی اور مستقل تصنیفیں دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ

[1] خان بہادر شیخ عبدالقادر بی۔اے

شاید ہمارے فاضل دوست کے زمانہ میں اور اُردو رائج ہوگی کیونکہ جو زبان ہمارے آجکل کے اہلِ قلم لکھ رہے ہیں وہ عام فہم کیا معنی خاص فہم بھی نہیں۔ خاص الخاص فہم یا شاذ فہم ہے۔ اسے تو کروڑ کیا نو ہزار آدمی بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہونگے۔ حال میں آپ کے ہاں ایک سوشل تقریب ہو چکی ہے۔ میرا مطلب لالہ لاجپت رائے کی دعوتِ چائے سے ہے۔ جو ترکی وفد کے اعزاز میں دی گئی۔ آپ نے ذہن نشین کئے، وہ الفاظ جو لال چاند دل کے ٹکھیا حضرت لیاقت بے کی زبان مبارک سے نکلے ؛ اُنھوں نے فرمایا میں اُردو سمجھ تو لیتا ہوں۔ لیکن آسانی اور صفائی سے بول نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ چاہتے تو اُردو میں ہی اپنا مطلب ادا کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ہماری میعادی لٹریچر کی زبان دیکھ کر سہم گئے۔ کیونکہ وہ ایسی زبان بولنے پر قادر نہ تھے۔

القصّہ پروفیسر سلیم اور ناظر دہلوی سے میرا پورا اتفاق ہے۔ کہ اگر اُردو کو ہندوستان کی زبان بنانا منظور ہے تو اسے عربیرانی (یعنی عربی - ایرانی) کی بجائے "ہندُالمانی" زبان بنائیے۔ جہانتک ہو سکے اس کے معلومات اور علمیّت کے خزانے میں ترقی کیجئے۔ لیکن برائے خدا اس کی "اُردوئیت" کو حلال نہ کیجئے۔ ۱۸۷۰ء میں جب اودھ پنچ نکلنا شروع ہوا۔ تو اکبر مرحوم نے منشی سجاد حسین صاحب مغفور کو لکھا تھا۔

مرضی تھی خدائے دو جہاں کی
محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ
ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

مَیں دیکھتا ہوں آپ کو انتظار ہے کہ مَیں اپنے آج کے موضوع کے آخری حصّہ پر کیا کہونگا۔ آج کا موضوع رکھا گیا تھا "اُردو پنجاب میں"۔ لکچر کے اعلان میں پنجاب کا نام دیکھ کر ضرور کان کھڑے ہوئے ہونگے لیجئے سُنئے۔ اُردو کہاں پیدا ہوئی۔ اور اس نے کہاں نشو و نما پایا۔ یہ ایسے سوال ہیں۔ جن کا جواب شافی نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے تفننِ طبع کے طور پر کبھی کچھ لکھ دیا تو اسے الہام اور سرتی سمجھ کر پلّے نہیں باندھ رکھنا چاہیئے۔ آزاد مرحوم نے اس تنقیح پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"اسے فقط شاہجہان آباد کا اقبال کہنا چاہیئے۔ کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اُردو (اُردو بازار) کی طرف منسوب مشہور ہو گئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہو۔ کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اسی وقت

سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔"

اگلے زمانے کے بزرگ بھی کتنے راستگو اور انصاف پسند تھے۔ آزاد مرحوم اگرچہ دہلی کے تھے لیکن اُنھوں نے اُردو کا سب سے اول باضابطہ شاعر ولی دکنی کو تسلیم کیا۔ امیر خسرو دہلوی کو نہیں۔ حالانکہ قرائن موجود تھے۔ کہ وہ امیر خسرو کے سر پہ سہرا باندھتے۔ مگر نہیں جو سچ جانا وہ لکھا۔ وہی بات کہی جو دھرم لگتی تھی۔ انہیں کے اس قول کی بنا پر جس سے کسی کو مجال انکار نہیں ہوسکتی۔ یہ کتنا قرین انصاف ہے کہ واقعات حاصلہ کو ذہن نشین رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے استدلال کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پنجاب اُردو کے قدیمی منسوبات میں سے ہے۔ مبادیات کی بحث میں زیادہ دُور تک جانا بے سود ہوگا۔ واقعات بداہت سے شہادت دے رہے ہیں۔ مگر میرا روئے سخن عہدِ حاضرہ کی جانب ہے۔

پنجاب کو اُردو سے تعلق ہے۔ یہ امر تسلیم کرنا پڑیگا۔ اگرچہ پنجاب نے اپنی پنجابی سے کبھی سرد مہری کا برتاؤ نہیں کیا۔ اس کا باعث خواہ پنجاب کا اورینٹل کالج قرار دیا جائے۔ خواہ دہلی کا قرب اور خواجہ ناشی یا یہ واقعہ کہ اُردو کی نئی یا نیچرل شاعری کی بنیاد اہل دہلی کے ہاتھوں پنجاب میں ہے۔ اسی شہر لاہور میں رکھی گئی۔ یا یہ بات کہ جس طرح شاہ عالم ثانی کے عہد میں روہیلوں اور مرہٹوں کے ہاتھ سے دہلی کی تباہی ہوکر اس کے ہر علم و فن کے باکمال لکھنؤ میں جا بسے تھے اسی طرح ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب میں چلے آئے۔ اور جس طرح اُس وقت پُورب کو اُردو سکھائی تھی۔ اب پچھم پر توجہ ارزانی فرمائی۔ غرضکہ علت غائی کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ بدیہی واقعہ ہے۔ کہ پنجاب ان خطوں میں سے ہے جنہیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی اور توسیع میں پنجاب کا جو مہتم بالشان حصّہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تصانیف و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی تعداد جو یہاں سے ہر سال اشاعت پاتی ہے۔ حکومت اور یونیورسٹی، جس حوصلہ افزائی اور کشادہ دلی سے اُردو کی سرپرستی کرتی ہے اس دعوے کی حجت ناطق ہیں۔ اُردو ادب اور تہذیبِ انشا کے باب میں پنجاب کے شعرا اور اہلِ قلم کا بڑا حصّہ ہے بایں ہمہ میں حیرت اور افسوس سے دیکھتا ہوں کہ اہل زبان کا ایک طبقہ پنجاب کے ساتھ نہ صرف سرد مہری کا بلکہ معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ بیشک پنجاب کو ان حضرات سے ایسی توقع نہ تھی۔ لیکن اس پر بھی پنجاب نے تحمّل اور تمکین سے کام لیا۔ اور یہ اوصاف اس کے شعار میں داخل ہیں۔ اب جو یہ تذکرہ آگیا ہے تو کہنا پڑتا ہے ادبی نہیں مقامی وجوہ تھے۔ بڑے قوی اور محرک وجوہ

تھے۔ جنہوں نے لکھنؤ کے ایک حصّہ کے ہاتھوں پنجاب
کے ساتھ یہ غیر متوقع سلوک کرایا۔ اول یہ کہ اُردو کے مرکزوں
کے اعتبار سے پنجاب دہلی کا پیرو ہے (دیکھو مولوی عبدالحلیم
صاحب شرر لکھنوی کا مضمون " دہلی اور لکھنؤ کی اُردو "
مندرجہ رسالہ دلگداز مطبوعہ مئی ۱۹۱۸ء) معترض یہ سمجھے
کہ پنجاب پر حملہ کرنے سے وہ دہلی کی طاقت کو صدمہ پہنچائینگے
دوسرا موجب اس قابلِ تحقیر و اکراہ تعریض کا یہ ہوا ہوگا کہ
ان کو خوف ہُوا کہیں ایسا نہ ہو کہ پنجاب بھی ان کی طرح
دہلی سے آزاد ہو کر خود مختار ہو جائے۔ اور کل کو انکا مدِ مقابل
بن جائے۔ آپ نے اہلِ فرنگ کی امریکہ کے رواجِ غلامی کی
تاریخ میں پڑھا ہوگا۔ کہ جو دیسی غلامی سے آزاد شدہ تھے
وہی غلاموں پر زیادہ تشدّد کرتے تھے۔ اور اُن کی آزادی کے
دشمن تھے۔ اُردو ادب کے باب میں اہلِ زبان فرقہ کی وُہ
پالیسی ہونی چاہیئے جس کا رنگ امریکہ کی خود مختاری کے بعد
سے اپنی نو آبادیوں کے متعلق انگلستان کے تمدّن اور تدبّرِ
سیاسی کے کوایف میں نمایاں ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت
مجلسِ بین الاقوام یعنی لیگ آف نیشنز کے ووٹوں کا
ضابطہ ہے۔ اس میں انگلستان نے کشادہ دلی یا خود غرضی
نہیں، بلکہ نہایت عاقبت اندیشی اور سیاسی دانشمندی
سے آسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ حصّے کہ ہندوستان کو بھی
برابر کا ایک ایک ووٹ کا حق دلوایا۔ دہلی میں اِس
دور اندیشی کی وجاہت تھی۔ اس نے پنجاب کی ترقیاتِ اُردو
پر ہمدردی اور مسرت کا اظہار کیا۔ لکھنؤ اس سے عاری
تھا۔ خواہ مخواہ مخالفت پر تل گیا۔

اس میں کوئی شکوے کی سزاوار بات نہیں۔ کوئی
مقام یا خطّہ کیوں نہ ہو جہاں کی مادری زبان اُردو نہیں
ایسی ہر جگہ میں آپ کو مقامی خصوصیات ملیں گے۔ جو آپس
میں باعتبار نوعیت باختلاف ہمدگر متنازع فیہ ہوں گے
کیوں نہ اسی قبیل سے پنجاب کے خصوصیاتِ اُردو کو بھی تصوّر
کیا جائے۔ واقعاتِ حاضرہ بیّن طور پر شہادت دے رہے
ہیں کہ دُنیا کی زبانیں اب اہلِ زبان کی چودھراہٹ کے
قدغن سے نکلکر معقولیت کا پیرایہ پکڑتی جاتی ہیں۔ اب وہ
زمانہ نہیں رہا کہ ہر کس و ناکس بیساختہ یہ کہہ اُٹھے کہ نہیں
اس کے معنے یہ ہیں۔ اور ہم چونکہ اہلِ زبان ہیں۔ لہذا ہمارا
قول صحیح اور آپ کا غلط۔ مَیں اس کی تصریح کی غرض سے
امپیریل لیجیلیٹو کونسل اور پنجاب کی کونسل کی روداد سے
ایک ایک نظیر پیش کرونگا۔ جن کا تعلق اسی بحث سے ہے
دہلی کی کونسل میں ایک لفظ پر جو عالمانہ مباحثہ آنریبل
سر جارج لونڈز اور آنریبل پنڈت مدنموہن مالوی کے
درمیان ایک مسودہ قانون کی بحث کے دوران میں ہُوا۔
نہایت دلچسپ ہے۔ سر جارج نے لندن کی ایک
قانونی رپورٹ سے یہ جملہ نقل کیا تھا۔

["An application was made on the part of Fitzerald in the court of Exchequer to set aside the verdict obtained against him by Mr Wright, which was dismissed with full costs."]

اس کا ترجمہ یہ ہے :-

ایک مرافعہ فٹز جیرلڈ کی جانب سے عدالت اکسچکر میں دائر کیا گیا۔ بدیں غرض کہ وہ حکم تعزیری جو مسٹر رائیٹ نے اس کے خلاف حاصل کیا تھا مسترد کیا جائے۔ جو مع خرچہ کے خارج کیا گیا۔

بحث لفظ "which" یا "جو" کی ضمیر سے تھی۔ کہ وہ کس کی طرف راجع ہے آیا مرافعہ کی طرف یا حکمِ تعزیری کی طرف۔ سر جارج پنڈت صاحب کو قایل نہ کر سکے۔ اور میری یادداشت صحیح ہے تو یہ قرار پایا۔ کہ اصل رپورٹ میں قرینہ اور ربطِ عبارت دیکھا جائے۔ مگر وہ اسوقت اجلاس میں موجود نہ تھی۔ اس قسم کا دوسرا معاملہ ستمبر ۱۹۱۳ء کے جلسہ پنجاب کونسل میں پیش آیا۔ جبکہ آنریبل مسٹر شادی لال صاحب نے جو آجکل پنجاب کے چیف جسٹس ہیں۔ آنریبل سر مایکل فنٹن کے آبکاری کے مسودہ قانون پر انشا اور اسلوب کے اغلاط کی بنا پر ایک نہیں دو نہیں سولہ اعتراض وارد کئے۔ جو تسلیم کرنے پڑے۔ حالانکہ فنٹن صاحب اپنے وقت کے پنجاب کے سویلین جرگہ میں منشئ بے بدل تھے۔ اور لونڈز صاحب لنڈن کے ہائیکورٹ کے نامی بیرسٹر اور گورنمنٹ ہند کے وزیر صیغۂ قانونی تھے۔ اگر الہ آباد کا ایک ہندوستانی گریجوائٹ جو کبھی ہندوستان کے باہر نہیں گیا۔ لونڈز صاحب کی عبارت پر اور لاہور کے کالج کا ایک گریجوائٹ فنٹن صاحب کی انشا پردازی پر ایسے معقول اعتراض کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ پنجاب کے ایک ادیب اور شاعر کو یہ حق نہ ہو کہ وہ اہلِ زبان کے کلام پر اظہار رائے کر سکے۔

اب جو بات یہانتک پہنچ گئی ہے تو میں اپنے پنجابی بھائیوں سے یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ وہ باوصف ہر امر کے اُردو کے باب میں اس غلطی سے بچیں۔ جس کا شکار ہمارے لکھنوی بھائی ہوئے۔ یہ معاملہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ مگر میں اس سے متعلق اپنا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالونگا۔ بلکہ چند اہل الرائے کے قول نقل کر دونگا۔ خواجہ حالی مرحوم اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں فرماتے ہیں :-

"ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب دِلّی بگڑ چکی، اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا۔ اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعراء لکھنؤ ہی میں

جارہے۔ اور دولت وثروت کے ساتھ علومِ قدیمہ نے بھی
ایک خاص حد تک ترقی کی۔ تو اس وقت نیچرل طور پر اہلِ لکھنؤ
کو ضرور یہ خیال پیدا ہُوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و
فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح زبان
میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دِلّی
کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے ۔۔۔۔۔
خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہُوئیں۔ کہ بول چال
میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ
کثرت سے داخل ہونے لگے۔۔۔۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ
نظم ونثر پر بھی غالب آگیا۔"

مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو جو نامی
رسالہ اُردو کے اڈیٹر اور حیدرآباد کے سررشتہ تعلیمات کے
نامور افسر ہیں۔ "انتخاب کلامِ میر" کے دیباچہ میں فرماتے
ہیں :-

"اب ایک سوال یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان
کے لکھنوی ہمعصروں اور مابعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟
اگرچہ میر صاحب کی خود اُن کے زمانہ میں بے انتہا قدر
ہُوئی۔ اور ابتک لوگ ان کی اُستادی کا لوہا مانتے ہیں
لیکن حیرت ہے کہ اُن کے آخر زمانہ نیز مابعد کی
شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہُوا۔ لکھنؤ کی شاعری
کا رنگ بالکل جُدا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ
اہلِ لکھنؤ جس کلام کی اسقدر دل سے داد دیتے تھے۔
اس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوتے

مولوی صاحب آگے چلکر فرماتے ہیں :- "لکھنؤ کی
ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی۔"

حضرت شوق نیموی اپنے بیش بہا رسالہ اصلاح میں
جو ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ کے قومی پریس سے شائع ہُوا تھا۔
لکھتے ہیں :-

مانا کہ ع ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است
اور بلند پروازی وجدت ایک عمدہ چیز ہے۔ مگر
مزے کے ساتھ ہو۔ غزل میں عشقیہ مضامین
درد انگیز معانی۔ پاکیزہ خیالات۔ سلجھی ہوئی ترکیبیں
نکھری ہوئی بندشیں۔ دلکش الفاظ۔ چلبلے جملے۔
مربوط مصرعے۔ پھڑکتے ہوئے شعر ہونا چاہئیں۔
سابق زمانے سے اکثر دِلّی والوں نے بیشتر ان
امور کا خیال رکھا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دِلّی کا
رنگ کہتے ہیں۔ میر و درد کا کلیات۔ نسیم دہلوی کا
دیوان۔ داغ کا کلام دیکھو کہ کسقدر مقناطیسی اثر
رکھتا ہے۔ لکھنؤ کے اگلے شعراء میں سے صبا
کی شیریں بیانی اور سحر کی سحر بیانی دِلّی والوں سے
ملتی جُلتی ہے۔ اور اب تو اکثر لکھنؤ والوں نے اپنی
طرز چھوڑکر وہی رنگ اختیار کیا ہے۔"

گورنمنٹ ہند امپیریل گیزیٹر آف انڈیا جلد دوم میں
ہندوستانی زبانوں اور دیسی بولیوں کے اعلے ترین ماہر ڈاکٹر
گریرسن کی زبان سے فرماتی ہے :۔

متاخرین اُردو شعراء میں سے جو دلّی کے مقلد تھے
ولی محمد نظیر قابلِ ذکر ہے۔ اگرچہ وہ آگرے میں
پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ اس کی تصانیف اس فارسیت
سے پاک ہیں۔ جس نے شعرائے لکھنؤ کی شاعری
کا چہرہ بگاڑا۔"

"اہل زبان" جو ایک مرکب اضافی ہے خواہ آپ اسے
بامعنی قرار دیں یا مہمل لیکن کیا آپ یہ سُنکر خاموش ہو جائینگے
کہ مدراس کے ایک پنجابی خواں شخص نے یا فرید پور کے تین
کوڑی بابو نے ایسی ہیر لکھی کہ فضل شاہ اور وارث شاہ کے
ہم پلّہ ہے۔ آپ یہ خود اندازہ فرمالیں۔ کہ آپ کے دل
کو اس وقت کیا احساس ہوگا۔ مَیں یہاں اہل زبان کا جھگڑا
اُٹھانے نہیں آیا ہوں۔ جو اصحاب مجھے جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی
جانتے ہیں۔ کہ مَیں مقامی تعصبات سے بالاتر ہوں۔ لیکن
آپ ہی فرمایئے۔ کہ اس کا کیا علاج کہ جب میں ٹھیٹ کی
پنجابی بولتا ہوں تو حالانکہ وہ لفظ صحیح معنی میں اور محل مناسب
پر بولا گیا ہے۔ مگر اس کے سُنتے ہی آپ ہنس پڑتے ہیں۔
کیونکہ تیس سال آپ کا ہمسایہ ہونے کے باوجود بھی میں
اس لفظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کرسکتا۔ وجہ کیا کہ مَیں جس
گھر اور شہر میں پیدا ہوا تھا وہاں پنجابی نہیں بولی جاتی ہے۔
یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک فن یا زبان کی پشتینی مزاولت
اور ایک زبان کے مادری ہونے کا امتیاز سائنس جدید کی
رو سے بھی تسلیم کرنا پڑیگا۔ کیا مَیں یہ کہنے کی مبادرت کروں
کہ پنجابی میں بھی فصاحت کا معیار معین ہے۔ مَیں اصلی
وڈّی ہیر کی طرف اشارہ کرونگا۔ میاں محمد الدین دھرمیاولی
اس کتاب کے دیباچہ میں وارث شاہ اور فضل شاہ کی ہیر
کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"لیکن جو شاعر اپنی عمر میں ایک ہی کتاب کو
بار بار سوچ کر بناتا رہا ہو۔ اور اس کی زبان کو
مانجھ مانجھ کر صاف کرتا رہا ہو۔ قاعدہ کی بات ہے
کہ وہ اس کی تصنیف جہانگیر منظوری اور عام مقبولیت
حاصل کرکے رہتی ہے۔"

آگے چلکر لکھتے ہیں :۔

"جس شاعر نے اپنی زبان میں محاورات و مصطلحات عوام
کو خوب دل کھول کر بیان کیا ہو ۔۔۔۔۔"

اسی طرح اگر ہمارے ملک کی آبادی کے ایک حصّہ نے
پشت در پشت اپنا یہ مشغلہ رکھا ہو کہ زبان کو مانجھیں اور
محاورات و مصطلحات کے صحیح استعمال کے طریقے قرار دیں۔ تو
وہ سچ مچ ہم سب کیلئے مایۂ ناز ہونے چاہئیں۔ جس طرح
سیّد وارث شاہ مرحوم پنجابی زبان کے باب میں ہیں۔ ایک

زبان کا روزمرّہ اور محاورہ ایسی چیزیں ہیں۔ کہ اس شخص سے سیکھنی ہی پڑیں گی۔ جس کی وہ مادری زبان ہے۔ صاحب قاموس کی نظیر آپ کے سامنے موجود ہے۔ ہاں فن اور قاعدہ کے باب میں کسی کو کسی پر شرف حاصل نہیں۔ دہلی سمجھے گی کہ اس کی زندگی اکارت نہیں گئی۔ جب پنجاب کے گھروں میں پہلا لفظ جو بچّہ کو سکھایا جائیگا وہ اُردو ہو۔

جن کو اہلِ زبان کہا جاتا ہے اور جو واقعی ہیں بھی، اُنہوں نے پنجاب سے سرد مہری کا سلوک کبھی نہیں کیا۔ داغ مرحوم ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

اہلِ کلکتہ سے لائق فائق
اہلِ لاہور ہوئے جاتے ہیں

(صفحہ ۲۵ ضمیمہ یادگارِ داغ)

مولوی سیّد مقبول احمد صاحب الہ آبادی ہمایوں کے اسی نمبر میں جس کا آگے ذکر آچکا ہے لکھتے ہیں:۔

"شبلی اکاڈمی۔ مولانا شرر کا ذاتی مطبع وطن اور پیسہ اخبار کی ایجنسیاں انجمن ترقیٔ اُردو، اور خواجہ حسن نظامی صاحب کا دفتر بالفعل اُردو لٹریچر کی اشاعت کا مرکز ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ اُردو کی اشاعت کے باب میں پنجاب کو دہلی اور لکھنؤ کے پہلو بہ پہلو رکھا گیا ہے۔

دسمبر ۱۹۰۵ء کے مخزن میں میرے فاضل دوست صدرِ جلسہ نے ایک تجویز اُردو اکاڈمی قائم کرنے کی شائع فرمائی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کا نام وضع کرنے میں بندہ بھی شریک تھا۔ یہ نام اُردو سبھا قرار پایا۔ ساری اُردو دُنیا اُردو کی ٹکسال اور اُردو کے مرکز یا مرکزوں نے نہایت گرمجوشی اور خلوص دلی سے اس تجویز کا استقبال کیا۔ متعدد اقتباس طولِ کلام کا موجب ہونگے۔ مَیں اس جگہ لکھنؤ کے رسالۂ معیار سے چند سطریں آپ کو سُنانا چاہتا ہوں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ اُردو کے متعلق ایک پنجابی تجویز کو کس طرح پزیرا کیا جاتا ہے:۔

"ہمارے مکرم دوست ایڈیٹر مخزن کی مبارک تحریک و تجویز پر لکھنؤ یا دہلی کے علاوہ اور اہلِ کرم بھی کمرِ ہمّت مضبوط باندھ لیں تو بہت جلد یہ خارزار گلستاں نظر آئیگا کسی جگہ اور کسی مقام پر کوئی متنفس ایسا نہیں جو فاضل بیرسٹر شیخ عبدالقادر صاحب کی اس بیش بہا تجویز کا تہ دل سے لبیک کہکر مؤیّد نہ ہو۔ ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری زبان اُردو ہے واقعی لیڈرِ قوم مسٹر عبدالقادر صاحب کی یہ تجویز کہ اُردو سبھا قائم ہو اور اس کے ذریعے سے زبانِ اُردو کا پژمُردہ باغ ہرا ہرا نظر آئے۔ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔"

آپ نے دیکھا کہیں مغایرت یا رشک کی نام کو بھی بو آتی ہے؟ اور پھر اس بات کو اٹھارہ بیس برس ہونے آتے زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اور اگر آج اُردو سبھا ایک جیتی جاگتی ہستی نظر نہیں آتی تو اس کی جگہ آپ کی انجمن ارباب علم موجود ہے۔ آپ اس کے ارکین ہیں نواب حیدر یار جنگ۔ حضرت ناصر نذیر فراق دہلوی۔ مولانا شوق قدوائی لکھنوی۔ حضرت چکبست لکھنوی اور حضرت شیدا دہلوی کے نام نامی پائینگے۔ اگر ان حضرات کے دل میں آپ کی طرف سے . . . . کچھ بھی مغایرت یا استخفار کی بو ہوتی تو وہ کب آپ کے ساتھ ملکر اُردو کی خدمت کرنے پر رضامند ہوتے

آج ایک اور بات جو آپ سے کہنی ہے یہ ہے کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ مَیں اپنے دوستوں سے یہی کہا کرتا ہوں کہ جب تمہارے کلام کی تنقید کی جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھا کرو کہ اس سے کیا کیا اور کہاں تک فایدہ اُٹھا سکتے ہو۔

نواب حیدر یار جنگ طباطبائی اپریل اور مئی ۱۹۲۰ء کے مشترکہ زمانہ میں ادب الکاتب کے عنوان سے ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔ " میرے ایک دوست اہل زبان انگریزی و فارسی پڑھے ہوئے ہیں میرے شاگرد بھی ہیں۔" ان حضرت کی تحریر کی غلطیاں اور اصلاح پہلو بہ پہلو شائع کی گئی ہیں۔ جن سے واقعی سبق لینا چاہیئے۔ مَیں پھر عرض کرونگا۔ کہ تنقید سے گھبرانا نہ چاہیئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ تمہارا نقاد کہاں تک تمہارے شکریہ کا مستحق ہے یعنی اس کے اعتراض کہاں تک درست ہیں۔ ان سے فایدہ اُٹھاؤ اور باقی کو بُھول جاؤ۔ نقادوں کو ہر کہیں بُرا ہی سمجھا گیا ہے۔ انگریزی کے شاعر جیمس رسل لول نے ایک نہایت دلچسپ نظم میں نقادوں کی تنقید یا تضحیک کی ہے۔ اس کا نام رکھا ہے۔

اس کے آخری حصہ کے چند اشعار کا ترجمہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔ تصرف اتنا ہی کیا گیا ہے کہ " جانسن کے تذکرۂ شعرا" کی جگہ اپنے اُردو کے شعرا کے تذکرہ آب حیات کا نام ڈال دیا ہے۔ اور میر انیس کی ایک مشہور رباعی کے مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی سے اس انگریزی کے ترجمہ میں ہندوستانی ماحول پیدا ہوگیا ملاحظہ ہو۔

حصہ استعداد کا فطرت نے ہر اک کو دیا
جو ملا جس گوں کا اس سے کام ویسا ہی لیا
شاعری تصنیف کی ہے قابلیت جس سے دور
وہ بھی تنقیدی مضامین لکھ کے چھاپے گا ضرور
کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے لے کے تنقیدیں کرے
زعم باطل بغض ذاتی اپنے شائع کردے

اس طرح ہر طفلِ مکتب آج بن بیٹھا ادیب
ہیں رسالے اس کی شہرت کے لئے گویا نقیب
پڑھ کے جنتہ جنتہ اور بے سمجھے وہ آبِ حیات
دیکھنے لگتا ہے اپنے پیشِ پا کل کائنات
بے تکلف جس طرح سیٹی بجاتا ہے کوئی
یوں وہ کر دیتا ہے تنقید اِک بڑی تصنیف کی
دھیان کب قولِ انیسی پر ذرا دیتا ہے وہ
پھول اور کلیاں ہٹا کر کانٹے چن لیتا ہے وہ
ایک ہے وقعت میں تعریض اس کی اور توصیف بھی
بلکہ ذم سے بڑھ کے ہے مدح و ثنا اس کی بُری
ڈھائی چاول لیکن اپنے وہ بگھارے گا ضرور
اسپہ وہ لکھے گا تنقید اور لکھے گا ضرور
اس طرح بٹ کر بناتا ہے وہ اک محکم رسن
جس کے پھندے میں لٹک جاتا ہے خود وہ
پر فتن دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں سب بر ملا
بھائی یہ کر جگ ہے کرنی کا یہ دیکھو پھل ملا

خاتمہ پر ایک گزارش کرونگا - اور وہ یہ ہے - کہ قوم کی زبان بنانا یعنی اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک انسان یا ایک جرگہ کا کام نہیں - اس کے لئے جمہورِ متعلقہ کے مساعی درکار ہیں - کام جو کرنا ہے - وہ بے اصول توسیع کا نہیں - بلکہ اِس میں زبان کی تہذیب و تدوین بھی شامل ہے اسکی علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ اس کی لطافت اور ترنّم کا بھی لحاظ رکھنا ہے - الفاظ کے ذخیرہ اور محاسن ادبی کی بھی توفیر لازم ہے اور یہ بھی مدِّ نظر رکھنا ہے - کہ جو خوبیاں پہلے سے اُردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں - اس کام میں پنجاب دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مِل کر ممتاز اور نمایاں حصّہ لے سکتا ہے - اس میں انگریزی دان عربی دان اور سنسکرت دان اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان سخن سنج اور ناظم و ناثر علمی اشغال میں مصروفِ کار اور صاحبِ تخیّل - صیرفی اور فلسفی سخن فہم اور نقاد و مبصّر سب کے شریک کار ہونے کی ضرورت ہے -

صاحبِ علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار
باغِ اُردوئے معلّےٰ میں تب آئے گی بہار

کیفی

شامِ تاریک

(۱)

چھائی ہے جہاں پہ شام تاریک سر پر آنچل سیاہ و باریک
دریا ہیں ظلمتوں کے جاری خاموش ہے کائنات ساری
آواز رحیل کارواں بند دشواریٔ راہ کا بیاں بند
طائر سب آشیاں میں روپوش خواب معصومیت سے مدہوش
گلزار و ہزار سار خاموش یعنی ساری بہار خاموش
رنگینیٔ زر فشانِ انجم شادابیٔ کاروانِ انجم
نورِ مہتاب کا تبسم قطعہ دریا کے خرام کا ترنم
گلہائے نظر نواز کے رنگ گلہائے چمن طراز کے رنگ
تاریکی انتظار میں گم اندوہِ غم آشکار میں گم
مطرب کا ساز سو گیا ہے نغمہ خاموش ہو گیا ہے

(۲)

انوار سیاہ جاگ اُٹھے ہیں عشرت کے گناہ جاگ اُٹھے ہیں
روشن ہے دیار عیش کوشی رندی مستی شراب نوشی
نغمے رقصاں ہیں عاشقی کے شہرے ہیں طریق آذری کے
غلبہ مستی نے پالیا ہے نیکی نے مُنہ چھپا لیا ہے
برسینگے یہاں گناہ کے پھول عشرت کی جلوہ گاہ کے پھول
کچھ نشہ فضا میں پیرتا ہے شیطان ہوا میں تیرتا ہے

(۳)

وہ حسن سیاہ کار نکلا | وہ غیرتِ صد بہار نکلا
اک بار چمک اُٹھیں فضائیں | اِکبار مہک اُٹھیں ہوائیں
شاداب و کامران و گل پوش | رنگینیٔ عاشقی سے بیہوش
پیراہنِ ریشمیں بدن پر | گلرنگ و مرمریں بدن پر
اندازِ شباب گل بدامن | آنکھوں میں شمع حسن روشن
ہر ایک ادا ہوس کا پیغام | ہر ایک نگاہ عشرت انجام
آنکھوں کی سرنگینیوں میں | قطعہ غمزوں کی نازنینیوں میں
اطوار تمام دلبری کے | انداز تمام ساحری کے
شانوں پر فتنہ خیز گیسو | بکھرے ہوئے مشک ریز گیسو
ہر عشوۂ بے قرار عُریاں | ہر غمزۂ سحرکار عریاں
پاؤں میں لچک جوانیوں کی | بارش ہے گلفشانیوں کی
لغزش رفتار کی غضب ہے | گویا کہ رواں ہے موجۂ مے
ہونٹوں پر موجزن تبسّم | گویا کہ چمن چمن تبسّم

(۴)

اس حسن سے ہے بہارِ ہستی | رنگینیٔ زرنگارِ ہستی
ننگ و ناموس کو بھلا کے | بس میں ہو تو میں کہوں یہ جا کے
"تم زینتِ شامِ زندگی ہو | تم صبحِ دوامِ زندگی ہو"

عابد

تبدیلِ نظریہ

حامد۔ عزیز۔ احسن۔ یوں تو سبھی نئی روشنی کے تعلیم یافتہ لطیف الخیال اور با مذاق نوجوان تھے۔ مگر اسحاق اپنی غیر معمولی فراوانیٔ شعریت کے سبب "یارانِ طریقت" کے مجمع میں ایک نمایاں خصوصیت کا مالک تھا۔ اُس کی زندگی کا جذباتی پہلو اسقدر روشن اور واضح تھا کہ دوسری تمام خصوصیات اس میں مدغم ہوگئی تھیں۔ اُس کے چہرہ کی بشاشت، لبوں کا دائمی تبسّم اور ہر وقت زیر لب گنگناتے رہنا، اُس کے جذباتِ رقیق کے صحیح مظہر تھے۔ یوں تو ہر حسین چیز کو دیکھ کر وہ پھڑک اُٹھتا تھا۔ مگر اُس کے خیال کی کبھی نہ رُکنے والی روانی اور اُس کا جوشِ اضطراب جو دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا، اُس وقت قابلِ ملاحظہ ہوتے تھے۔ جب اُس کا موضوعِ کلام نسائیت۔ ہو۔ وہ کہتا تھا" حسن جہاں بھی ہو، اور جس رنگ میں ہو دلکش ہے۔ اگر تاج محل کی حسین نقاشی اور رنگین دلفریبی اُسے از خود رفتہ و مجنوں بنا دیتی تھی تو قطب الدین ایبک کے عبرت آموز مزار کی کس مپرسی اور شکستہ حالی بھی اُس کے جذبات میں ایک طوفان بپا کر کے اُس کی آنکھیں پرنم کر سکتی تھی۔ اب وہ یکسر سوز و گداز ہوتا اور بار بار کہتا۔ " یہاں حُسن سوگوار ہے اور وہاں محوِ آرائش"

وجدان اس کے نزدیک آرٹ یا اُسی کے الفاظ میں حُسن کی انتہا تھی۔ کیونکہ وہ آرٹ کو حُسن سے کوئی علیحدہ چیز نہ سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صنّاع کا کام حُسن کی تخلیق ہے اور اسی تعریف کے ماتحت وہ اپنے تئیں نصف صنّاع سمجھتا۔ کیونکہ وہ حُسن کا خالق نہ تھا پرستار تھا۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ اُس کی فطری خصوصیات تھیں یا اکتسابی مگر کچھ بھی ہو اُس کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف تھا۔ وہ صرف خوش رہنا چاہتا تھا۔ اور حُسن کا مشاہدہ اُس کے نزدیک حصولِ مسرت کا بہترین ذریعہ تھا۔ اُسے اپنے ارادے پر پُورا پُورا اختیار تھا۔ اور پیہم کوشش سے اب یہ بات اُس کی فطرت میں داخل ہوگئی تھی۔ کہ وہ ہمیشہ دُنیا کے روشن پہلو پر نظر رکھتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا۔ کہ زندگی کا کوئی تاریک پہلو بھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ مَیں اور وہ ریل کے سفر میں ہمراہ تھے۔ برسات کا موسم تھا، اور وہ اپنے مخصوص انداز میں برسات کی دلفریبیوں اور اُن امنگوں پر جو ایک حسّاس طبیعت میں پیدا ہُوا کرتی ہیں۔ تقریر کر رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوگیا، تو مَیں نے کہا۔" بھئی اسحاق تم کہتے تو

بالکل درست ہو۔ جب کبھی کوئی حسین صورت دیکھنے کا
اتفاق ہوتا ہے یا کسی کا تصوّر ہی دماغ میں آتا ہے، تو
طبیعت میں ایک سرور سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ
کے لئے ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ رُوح ایک بھاری بوجھ
سے آزاد ہو گئی ہے۔" اُس نے میری طرف گھورتے ہوئے
جواب دیا۔ "یاد رکھو، یہ بھی ایک کمزوری ہے۔ کیوں نہیں
تم اُس سرور کو دائمی اور رُوح کی مسرت کو غیر فانی بنا لیتے؟"

"کیونکر؟" مَیں نے اس بیتابی سے پُوچھا۔ کہ گویا
وہ کوئی کیمیا کا نسخہ بتا رہا تھا۔

"کیونکر؟" اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔
"یہ تو معمولی بات ہے۔ تمہارا یہ خیال تو صحیح ہے۔ کہ
حُسن کا مشاہدہ طبیعت میں مسرت اور رُوح میں سرور
پیدا کرتا ہے۔ اور اگر تم واقعی چاہتے ہو، کہ وہ سرور
چوبیس گھنٹے قائم رہے تو اُس کا بہترین طریق یہ ہے۔ کہ
ہر وقت حسن کو اپنے پیشِ نظر رکھو۔"

مَیں نے کچھ مایوسانہ انداز میں کہا۔ "بہت مشکل!
کسی حسین صورت سے دوچار ہو جانا تو اتفاق کی بات
ہے۔ ورنہ تمام دن اندر کے اکھاڑے کی سیر کسے نصیب
ہوتی ہے؟"

"آہ یہی تو مصیبت ہے کہ تم لوگ عمداً خوشی کو ضائع
کر دیتے ہو۔ دُنیا ایک نگار خانہ ہے، جس کا ہر نقش اپنے
اندر کچھ نہ کچھ حسن رکھتا ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے
کہ "دیدۂ دل وا کرے کوئی" سطحی نظر رکھنے والے شخص
کو چیزیں بدصورت اور ڈراؤنی بھی نظر آتی ہونگی۔ مگر کیسا
خوش نصیب ہے وہ شخص، جو ہر شے کو حسین دیکھنے کی کوشش
کرتا ہے۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ دُنیا میں
ہر شخص واقعات عالم اور اپنے گردوپیش کی چیزوں کو ایک
خاص عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ بعض کے شیشے
رنگدار اور بعض کے سفید ہیں۔ ہر چیز دیکھنے والے کی عینک
کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اور وہ نادان سمجھتا ہے کہ
اُسے چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آ رہی ہے۔ اگر حبشی آئینہ
میں اپنی بدزیب اور بھونڈی صورت دیکھ کر آئینہ کو
مطعون کرتا ہے، تو اُس میں آئینہ کا کیا قصور؟ میری
بات مانو۔ اگر واقعی خوش رہنا چاہتے ہو، تو ہر چیز میں
حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ آج سے کئی سال قبل
اسی نکتہ کو فطرت شناس غالب کس خوبی سے بیان
کر گیا ہے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

دیکھو وہ نوحۂ غم میں حسن اور رونق تلاش کرتا ہے۔
اور یہی کامیاب و مسرور زندگی کا راز ہے۔"

اسحاق کا نقطۂ نگاہ غلط ہے یا صحیح اس سے ہمیں

بحث نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود اس پر عمل پیرا تھا۔
نظرِ اوّل میں تو یہ خیال مجذوب کی بڑ سے زیادہ معلوم نہیں
ہوتا۔ مگر اسحاق کی ذات ایک بیّن ثبوت تھی اس بات کا
کہ یہ ایک اصول ہے جس پر کاربند ہونا ممکن ہے۔

علم و فضل کے لحاظ سے بھی اسحاق ہماری سوسائٹی کا
ممتاز فرد تھا۔ وہ کسرِ نفسی سے گو اپنے تئیں نصف صنّاع
کہتا، مگر میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ تمام خصوصیات
موجود تھیں جو کسی صنعت کو کامیاب بنا سکتی ہیں۔ وہ
ادیب تھا۔ شاعر تھا۔ اور خوش تقریر تھا۔ اُس نے گفتگو
کرنا بھی ایک آرٹ کی طرح سیکھا تھا۔ باتیں کرتے وقت
وہ اپنے مخصوص انتخاب الفاظ کی مدد سے بہت جلد
مخاطب پر چھا جاتا تھا۔ ہماری بزم میں جب کسی مسئلہ کے
تصفیہ میں آرا مختلف ہوتیں اور انفرادی رائے کی قربانی
بھی گوارا نہ کی جاسکتی۔ تو اس وقت اسحاق اپنی جادو بھری
تقریر سے ہم سب کو مبہوت کر کے اپنا مقصد حاصل کر لیتا
اور لطف یہ ہے کہ کسی کو شکایت کا موقع بھی نہ رہتا تھا
اُس کے الفاظ۔ لب و لہجہ اور اضطراری و غیر اضطراری
حرکات تمام تیقن اور وثوق سے پُر ہوتی تھیں۔ اور ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں کسی مضبوط و مستحکم چٹان پر
قائم سمجھتا ہے۔ جہاں سے باد و باراں کا زبردست طوفان
بھی اُسے نہیں ہٹا سکتا۔ برسات کی بھیگی ہوئی ہوا اور

ابر آلود فضا۔ بہار کی ولولہ انگیز صبح اور خمار آفریں شام
خزاں کی حسرتناک اور سنسان خاموشی۔ غرض قدرت
کا ہر منظر اور فطرت کا ہر پہلو اسحاق کے لئے بے شمار
دلآویزیوں کا مرقع تھا۔ اُس کی آنکھیں ہر مقام پر
اکتسابِ حسن میں مصروف ہوتی تھیں۔ دیہات کی سادہ
اور چپ چاپ زندگی میں، ندی کی خاموش روانی کے
دھیمے دھیمے سروں کے ساتھ یا لکّے ہرے بھرے
لہلہاتے کھیتوں کے درمیان اگر وہ مسحور جذبات ہو کر
لطیف سے لطیف شعر کہہ سکتا تھا، تو ریلوے اسٹیشن
کے پُر شور ہجوم یا غروب آفتاب کے بعد انارکلی بازار
کے دھکم دھکے میں وہ اکثر اپنے افسانوں کے کیریکٹر
تلاش کرنے کے لئے نکل جاتا تھا۔ ملک کے ادبی رسالوں
میں آئے دن اُس کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے
مگر جیسا میں نے پہلے کہا ہے۔ وہ اپنے الفاظ کا بہترین
ذخیرہ اور سارا زورِ قلم اُس وقت کے لئے اُٹھا رکھتا تھا۔
جبکہ اُس کا موضوع نسائیت ہو۔ عورت اس کے نزدیک
حسن کا مظہرِ ارتقائی تھا۔ اور وہ کہتا تھا کہ قدرت کی
بہترین صنعت عورت ہی ہے۔ اور اس کی تخلیق کے
بعد اب صانع خود اپنے فن کا اس سے بہتر نمونہ پیش
نہیں کر سکتا۔ یوں تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ اور زندگی کا
ہر شعبہ اسے بیتاب کرنے کے لئے اپنے اندر کچھ نہ کچھ

حسن رکھتا تھا۔ مگر اُس کی وارفتگیٔ مزاج اور رفعتِ خیال اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی جب وہ کسی دوست کے چھیڑ دینے سے نسوانی حسن پر تقریر کر رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا سینہ تلاطمِ جذبات سے پھٹا جاتا ہے۔ اور وُہ اُن تمام خیالات کو جو اُس کے اندر سما نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے بیک وقت نکال دینا چاہتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے بے خبر خدا جانے وہ کیا کچھ کہہ جاتا تھا۔ اس قسم کی شاندار تقاریر سے ہمیں مرعوب کر لینا تو اس کیلئے آسان تھا۔ مگر شادی شدہ احباب اس کی ان حرکات پر ہمیشہ ہنستے اور اُس کے تمام جوش و خروش کو جنون سے تعبیر کرتے تھے۔ ایک روز مسعود نے تنگ آ کر اُسے ٹوک دیا۔" اسحاق رہنے بھی دو اپنے اس فلسفہ کو، ہم خوب سمجھتے ہیں۔ اگر تم پرستارِ نسائیت ہو تو تمہیں مبارک ہو یاد رکھو یہ پرستش اُسی وقت تک قائم ہے جب تک صنفِ نازک کے کسی فرد سے تمہیں ذاتی مواصلت جسے اصطلاحِ عام میں شادی کہتے ہیں۔ نصیب نہیں ہوتی۔ بیسویں صدی کا ہر نوجوان تمہاری طرح ایامِ شباب میں رنگا رنگ کی دلفریبیوں سے مغلوب ہو کر عورت کو پھول، موسیقی اور خوشبو کا مجسمہ سمجھا کرتا ہے۔ مگر دیکھیں گے چند سال بعد تمہارا نظریہ کیسے قائم رہتا ہے۔ ہمارے محدود تمدن میں اتنی گنجائش تو ہے نہیں کہ ہماری شاعرانہ بلند پروازیاں حدِ تکمیل تک پہنچ سکیں اس لئے مجبوراً ہم اُس شعریت کو جو دراصل ہماری ہی طبائع کا جزو ہے۔ جنس مقابل میں منعکس دیکھنے اور نادانی سے سمجھتے ہیں کہ عورت سراسر شعریت اور سراپا لطافت ہے۔"

"اگر تمہاری کم نظری اور کوتاہ اندیشی نے ہمارا تمدن محدود اور معاشرت خراب کر دی ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اگر تمہاری لاعلمی اور خود غرضی نے عورت کے حقوق ملیامیٹ کر کے اُسے سوسائٹی میں کوئی درجہ نہیں دیا، تو اس کے لئے تم قابلِ ملامت ہو۔ نہ کہ وہ معصوم ہستی جو ہر بار تمہاری بہیمیت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔" اسحاق بڑے طیش سے گفتگو کر رہا تھا۔" ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک تم جیسے لوگوں کی جنہوں نے عورت کو ہمیشہ ذلیل کیا۔ اور اُسے اپنا آلۂ کار بناتے رکھا۔ کمی نہیں رہی۔ مگر یاد رہے کہ دُنیا بدل چکی ہے۔ تمہارے خیال کے لوگوں کا دائرہ بہت تنگ ہو رہا ہے۔ عورت کے احسانات کے شکریہ سے تم کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے، اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ دُنیا کا بہترین سرمایہ اور مرد کا نصف بہتر عورت ہی ہے۔ اگر شادی کے بعد عورت کی شعریت اور عظمت تمہاری نظروں میں گر جاتی ہے۔ تو اس کا الزام تمہاری ایجاد کردہ رسومات اور تمہارے اخلاق پر آتا ہے۔ اپنے آرام

اور مسرت کے لئے تو تم ساتویں آسمان تک پہنچ جاؤ۔ مگر جہاں اُس ذات کا سوال آجاتے جو تمہارے غم والم میں شریک۔ تمہاری عزت وناموس کی محافظ۔ تمہاری بے دام کی غلام ہے۔ تو تمہاری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ وہ خوشنما پھول جو مہکی ہوئی ہوا میں، سورج کی جاں بخش حرارت میں اور موسم کی تازگی میں پرورش پاکر ایک عالم کو معطر کرسکتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں سڑی ہوئی گلیوں کے اندر آہنی دیواروں کے پیچھے شعاع آفتاب اور ہوا کے جھونکے سے محروم قبل از وقت مرجھا جاتا ہے۔ یہ انسانیت پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن"

"درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"

ردِ عمل شروع ہونے کو ہے۔ اور یاد رکھو اس کا سب سے پہلا وار تم ایسے لوگوں پر ہوگا۔"

- - - - - - - - - -

ایک روز اسحاق مجھ سے ملا۔ وہ کچھ اُداس سا نظر آرہا تھا۔ مَیں نے افسردگی کا سبب پوچھا۔ تو بڑی بددلی سے بولا۔ "ہم لوگ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان میں رہکر عورت کی فطرت کو سمجھنا ایک امرِ محال ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ اس کم فہمی کے باوجود ہم کیونکر اس دھڑلّے سے نسائیات پر اپنا قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ ایک فحش غلطی ہے جس کا اعادہ ہم سے ہر روز ہوتا ہے۔"

"تم نے یہ کیسے جانا؟" مَیں نے اس خیال سے دریافت کیا کہ دیکھوں اس کی نئی تحقیقات جس کی بنا پر یہ فیصلہ صادر ہوا تھا کیا کہتی ہے۔

"ہمارے ہاں پردے کی غیر معمولی سختی اور رسم و رواج کی پابندی ہونے کی وجہ سے کوئی موزوں اور مستقل طریقہ انتخاب زوجہ کا قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے شادی سے پہلے عورت ہمارے لئے ایک معما ہی رہتی ہے۔ مَیں سمجھتا تھا کہ متاہل ہونے کے بعد عورت کے مزاج کی تمام کیفیات کو سمجھنا آسان ہونا ہوگا۔ مگر بشیر کی شادی نے یہ خیال بھی باطل کردیا۔ بشیر کی شادی اس لحاظ سے بہت اہم تھی۔ کہ اُس کی بیوی خود اُس کا انتخاب تھی۔ اور شادی سے قبل وہ ایک دوسرے سے سالہا سال سے محبت کررہے تھے طبائع بالکل یکساں ہونے کے سبب انہیں یہ عام دقت بھی پیش نہیں آئی، جو شادی کے بعد ایک دوسرے کے خیالات سے ناواقف ہونے کی صورت میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ مگر مجھے بہت تعجب ہوا۔ جب بشیر نے گزشتہ ملاقات میں مجھ سے یہی شکایت کی جو آج مَیں تم سے کر رہا ہوں۔ وہ کہتا تھا کہ شادی کے بعد عورت کی زندگی کا صرف ایک پہلو یعنی اُس کا بیوی ہونا ہم پر واضح ہوسکتا ہے۔ اور اس حالت میں بھی وہ ہم سے بے تکلف نہیں ہوتی۔ کیونکہ ماحول سے متاثر ہوکر وہ ہمیشہ اپنے تئیں ہم سے کمتر

ہی سمجھتی ہے۔ اور جبتک اختلاف مراتب کا یہ احساس قائم ہے اُس وقت تک آپس میں گھل مل کر ایک دوسرے کی فطرت سے کما حقہ آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ دوستوں کے ساتھ ہمارے تعلقات موانست ابتدا میں معمولی ہم جلیس ہونے کی حیثیت سے رسمی علیک سلیک تک محدود ہوتے ہیں۔ پھر روزمرہ کی ملاقات اور تبادلہ خیالات سے وہ تعلقات ایک غیر شعوری طور پر بڑھتے بڑھتے دوستی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور بالآخر وہ دوستی رُوح کی ایک اشتہا بن جاتی ہے۔ جس سے علیحدگی بعض اوقات ہماری زندگی تلخ کر دیتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ دوستی پیدا کرنے میں فریقین کی جانب سے کبھی کوشش نہیں ہوتی اور عجیب بات یہ ہے کہ جب کبھی اس معاملہ میں ارادہ و کوشش سے کام لیا گیا ہے حصولِ مقصد میں ہمیشہ ناکامی کا سامنا ہُوا ہے۔ جب تک سوسائٹی میں عورت کے لئے موزوں مقام نہیں بنایا جاتا اور جبتک ہندوستان کی فضا میں یہ خوشگوار تبدیلی نہیں ہوتی کہ عورت سے جائز دوستی، جس کا نتیجہ مناکحت نہ ہو قائم ہو سکے۔ تب تک یاد رکھو عورت کی فطرت کو سمجھنا محال کیا ناممکن ہے۔ اور ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے ہاں کبھی کوئی اچھا افسانہ یا صحیح شعر لکھا جا سکتا ہے ؟ مثال کے طور پر ان اقوام کو دیکھ لو، جن کے تمدّن میں، عام مجلسوں، نمائشوں اور تماشہ گاہوں میں عورت کو ویسی آزادی حاصل ہے جیسی مرد کو۔ وہاں آئے دن علم النفس کے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ وہاں بہتر سے بہتر افسانے اور عمدہ سے عمدہ شعر لکھے جاتے ہیں۔ یہ صرف اس لئے کہ عورت مردوں کے درمیان ملی جُلی ہمیشہ اُن کی بالیدگیِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان کا نسوانی تمدّن بہت پست ہے۔ اس کو بلند کرنا میں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کر لیا ہے اور اب میری کوششیں اسی کام کے لئے وقف ہو چکی ہیں۔

- - - - - - - - - - - - -

حالات و واقعات تبدیل ہوتے گئے اور گردش کے عالمگیر اصول کے ماتحت ہمارا مجمع احباب بھی منتشر ہو گیا۔ اسحاق لاہور سے کہیں باہر چلا گیا۔ اور ایک مُدّت تک لاپتہ ہی رہا۔ اُس کے مشاغل کے متعلق بھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک روز سہ پہر کے قریب میں ہواخوری کے لئے باہر نکلا، تو دیکھا اسحاق صاحب بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ اس کو پہچاننے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ کیونکہ اُس کی بالکل قلب ماہیت ہو چکی تھی۔ اسحاق جو اس سے قبل انگریزی فیشن کا دلدادہ اور لباس کے بہترین نمونہ میں بڑی آن بان سے دیکھا جاتا تھا اب ایک بدزیب سی شروانی اور پاؤں میں ایک گرد آلود

بوٹ جسے کئی ہفتوں سے پالش نصیب نہ ہوا تھا، پہنے کسی دھن میں محو خدا جانے کہاں جا رہا تھا۔ اُس کی ہیئت کذائی سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ کانگرس کمیٹی کا والنٹیر ہو گیا ہے۔ مَیں نے آواز دی اور ملتے ہی پوچھا کہ "تم کب سے یہاں آئے ہوئے ہو؟"

"کل آیا تھا۔"

"تو پھر ملے کیوں نہیں؟"

"یونہی کچھ مصروفیت رہی۔ وقت نہیں مل سکا۔"

وہ کچھ رسمی سا جواب دیکر مجھے ٹال دینا چاہتا تھا۔ مَیں نے پھر پوچھا۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا الارنس باغ کی طرف ٹہلنے کے لئے نکلا تھا۔"

مَیں بھی ساتھ ہو لیا۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم باغ پہنچ گئے۔ بینچ پر بیٹھتے ہی میں نے پھر سلسلہ سوالات شروع کر دیا۔

"تم اتنا عرصہ کہاں رہے؟ تم نے خط بھی کوئی نہیں لکھا۔"

اسحاق۔ "مَیں ایک جگہ نہیں ٹھہرا بلکہ بہت سے مقامات پر پھرتا رہا ہوں۔"

مَیں۔ "لیکن تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم کچھ کھوئے کھوئے معلوم ہوتے ہو۔"

اسحاق۔ "ہاں یہ صحیح ہے۔ لیکن یہ ایک لمبی واردات ہے جسے شاید تم سُننا پسند نہ کرو۔"

مَیں۔ "نہیں مَیں ہمہ تن اشتیاق ہوں۔ تم شروع کرو۔"

"ناصر" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بولنا شروع کیا۔ "دُنیا میں عموماً واقعات خلاف توقع پیش آتے رہتے ہیں۔ ہم سمجھتے کچھ ہیں مگر پردۂ غیب سے کچھ اور ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایسی مایوسیاں کچھ وقت کے لئے ہماری پریشانی کا باعث تو ضرور ہوتی ہیں۔ مگر اندازہ کرو اُس ناکامی کا جو ہمیں ایسی مہم میں پیش آتی ہے جس کی تیاری پر ہم اپنا تمام سرمایۂ حیات خرچ کر چکے ہیں جس کی کامیابی و ناکامی پر ہماری زندگی اور موت کا انحصار ہے۔"

اسحٰق خاموش ہو گیا مگر مَیں نے بے صبری سے کہا۔ "ہاں آگے چلو۔" اُس نے ایک دل شکستہ آواز میں کہا۔ "بس ایسی ہی ایک ناکامی سے مَیں دوچار ہُوا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا سُننا چاہتے ہو؟"

مَیں نے پھر اصرار کیا۔ "نہیں مجھے تفصیل درکار ہے۔"

"اچھا تفصیل ہی سہی۔ یوں تو ہر چیز جس کا تعلق اس سفلی طبقہ سے ہے اپنی مقررہ میعادِ حیات کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ حتےٰ کہ انسانی خیالات اور اصولوں کی بھی ابتدا و انتہا ہے۔ مگر رُوح کی موت سب سے زیادہ

عبرتناک ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ ایک مرتبہ میں نے بڑے دعوے سے اپنا نصب العین ہندوستان کے نسوانی تمدن کا احیا قائم کیا تھا۔ یہ خیال جنون کی طرح مجھ پر قابو پا کر میری رُوح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوچکا تھا۔ اور عرصہ تک جگ ہنسائی کے باوجود میں انتہائی کوشش کے ساتھ اُس پر عمل بھی کرتا رہا۔ مگر افسوس یہ تارِ عنکبوت سے زیادہ کمزور اور ناپائدار نکلا۔ میں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اور اب حواس باختہ تشنہ کام لق و دق صحرا کے قلب میں کھڑا ہوں۔ مگر پانی کا کہیں بھی نام و نشان نہیں بشیر کی شادی کو ایک قابلِ تقلید نمونہ سمجھ کر میں ہمیشہ احباب میں اُس کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ طرزِ انتخاب کی دقتوں کے باوجود اُس نے اپنی پسند کی بیوی تلاش کرلی تھی۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو مگر یہ بتانا میرا فرض ہے کہ بشیر اب ہمیشہ کے لئے دُنیا سے رخصت ہوچکا۔ اور اُس کی موت نے مجھے بھی جیتے جی مار دیا ہے۔"

اسحاق کے ان الفاظ سے میں سُن سا ہوگیا۔ مگر میری طرف التفات کئے بغیر اُس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

"یہ الفاظ کہتے ہوئے میری زبان کانپ رہی ہے معلوم ہوتا ہے۔ میرے اعصاب میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کروں مجھے بہر صورت حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ بشیر فیروزپور میں تھا کہ یکایک تپِ محرقہ میں مبتلا ہوگیا۔ اکیس دن تک وہ چارپائی پر پڑا رہا۔ علاج وغیرہ میں بہت کوشش کی گئی۔ اور جب وہ صحتیاب ہوکر اٹھا تو صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ ایک ہفتہ تک تو خیر گزری۔ مگر اس کے بعد پھر بخار ہوگیا۔ یہ تپِ محرقہ کا دوسرا حملہ تھا۔ جس سے کوئی خوش قسمت ہی جانبر ہوتا ہے۔ سترہ روز بشیر بستر پر بیہوش پڑا رہا۔ اور آخر مر کر اس ضیق سے نجات حاصل کی۔ جس مکان میں بشیر بیمار تھا۔ اُس کے عین مقابل کسی ٹھیکیدار کا مکان تھا۔ وہ ٹھیکیدار میں اس کا نام بھول گیا۔ اچھا خوش وضع اور جامہ زیب نوجوان تھا۔ بشیر کی بیماری کے زمانہ میں میں نے اُڑتی ہوئی خبر سُنی۔ کہ بشیر کی بیوی اور اُس ٹھیکیدار کے درمیان کوئی سلسلہ نامہ و پیام جاری ہے۔ لیکن اس بات کو باور نہ کرسکتا تھا۔ اور نہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ روز بعد بے شمار زبانوں سے یہ بات میرے کانوں تک پہنچی۔ کہ اُن دونوں کے آپس میں مدت سے تعلقات قائم ہیں۔ ناصر یقین کرو میں پاگل ہوگیا تھا۔ بشیر کی چارپائی پر سر رکھ کر میں پہروں روتا اس لئے نہیں کہ وہ بسترِ مرگ پر اپنی قیمتی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ دنیا کیسی بے حیائیوں اور ناانصافیوں سے لبریز ہے۔ بشیر اپنے دوستوں کے لئے واقعی ایک بے بہا نعمت تھا۔ مگر اُس کی بیوی جسے اُس نے کن خواہشوں سے حاصل کیا تھا۔ محبت کے پردے

ہیں کیسی خطرناک سازش کر رہی تھی ہیں اکثر سوچتا ہوں کہ یا اللہ اس نازک اور حسین جسم کے اندر جسے ہم عورت کہتے ہیں تو نے کیسا بے رحم اور خود غرض دل رکھا ہے۔ وہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے کس سنگدلی اور دلیری سے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دُور کر دیتی ہے۔ اور مرد ہمیشہ اُس کے افسونِ چشم سے بیوقوف بنا ہوا اُس کی اُنگلیوں پر ناچتا ہے۔ دُنیا میں کتنی خونریزیاں اور تباہیاں محض اس ہستی کی خاطر وقوع میں آئی ہیں۔ مرد ہمیشہ اپنی فطری سادہ لوحی اور کمزوری کے سبب عورت کی ایک جنبشِ چشم اور خفیف سے تبسّم پر جس میں دھوکا۔ عیاری قتل اور نفس پرستی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اپنی جانیں فروخت کر دیتے ہیں۔ عورت اُسی وقت تک عورت ہے۔ جبتک وہ زیورِ عصمت سے مزیّن ہے۔ ورنہ ایک تباہ کن بلا ہے۔ جس کی زد سے محفوظ رہنے ہی میں سلامتی ہے۔ حقیقت مجھ پر روشن ہو چکی ہے اگرچہ دیر میں ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی زندگی کا مقصد بھی نمایاں ہو گیا۔ میں اپنی تحریر اور تقریر سے لوگوں کو بتاؤں گا کہ عورت ایک زہر ہے۔ اُس سے بچو۔ ورنہ اُس کا ایک گھونٹ طرفۃ العین میں تمہیں نارِ جہنّم میں پہنچا دیگا۔ اُس کی سیاہ عنبریں زلفیں جن پر تم اپنی زندگیاں نچھاور کرتے ہو، ایک خونخوار اژدھے کی طرح تمہارے گرد چنگل مار کر تمہارا خاتمہ کر دیں گی۔"

"اسحاق تم بہت سختی سے کام لے رہے ہو۔" میں نے بڑے صبر سے اُس کی لمبی تقریر سُننے کے بعد یہ الفاظ کہے۔

"نہیں۔ نہیں۔ انصاف یہی چاہتا ہے"۔ یہ کہہ اپنی لکڑی کا سہارا لیتے ہُوئے وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ناصر کیا سوچتے ہو؟ آؤ تم بھی میرے ہمنوا ہو جاؤ۔ عورت سے انتقام لینا ہی میری زندگی کا مقصدِ وحید ہے۔"

عاشق بٹالوی

تاثرات

سدا بہارِ محبت کا لالہ زار رہے
نگاہِ شوق رہے حسن با وقار رہے

فروغِ حسن اسی طرح سحر کار رہے
بہارِ ناز پہ یارب یونہی بہار رہے

زہے نصیب جو وہ مائلِ ستم ہی رہیں
زہے نصیب جو دل میرا داغدار رہے

ہزار ضبط کیا پھر بھی ضبط ہو نہ سکا
وہ دل ہی کیا کہ بھلا جس پہ اختیار رہے

ہمارا عشق رہا کامرانِ مستیٔ غم
کہ شادکام رہے گو بہ حالِ زار رہے

شبِ فراق سعادتؔ مسرتوں میں کٹی
کوئی خیال تھا وہ جس سے ہمکنار رہے

"سعادتؔ منہاس"

حبّابات

کوئی تدبیر بن آئی نہ کوئی آسرا نکلا
ہوئے برباد غم آخر یہ قسمت کا لکھا نکلا

چمن کا پتّہ پتّہ خون سے بلبل کے رنگیں ہے
چمن کا ذرّہ ذرّہ رازِ غم سے آشنا نکلا

ازل سے رنگِ حسن و عشق میں دلبستگی نکلی
کوئی رنگیں ادا نکلا کوئی رنگیں نوا نکلا

شمیمِ گیسوئے محبوب تیرے دوش پر نکلی
ترا احسان مرے دل پہ اے موجِ صبا نکلا

ظہیر

ناٹک کتھا کے سلسلے کی تیسری کہانی

مالتی اور مادھو

(از بھو بھوتی)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی پاٹ شالہ میں دو لڑکے پڑھتے تھے۔ ایک کا نام بھوری واسو اور دوسرے کا دیورت تھا۔ دونوں ہم عمر اور ہم جماعت تھے۔ اور انہیں ایکدوسرے سے بڑی محبت تھی۔ ایک ہی دن ان کی شادی ہوئی۔ اور ایک ہی دن دیورت کے ہاں لڑکا جس کا نام مادھو رکھا گیا اور بھوری واسو کے گھر لڑکی جس کا نام مالتی تجویز ہوا پیدا ہوئی۔ دونوں دوستوں نے کامند کی ناکامی بدھ مت کی ایک اُستانی کے ہاتھ پر سوگند کھائی کہ جب یہ بچے جوان ہونگے تو ان کا آپس میں بیاہ کیا جائیگا۔ ایک دن دونوں دوست مزے سے باتیں کر رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ بھوری واسو پدماوتی (اجین) کے راجہ کا اور دیورت کندنا پور (برار) کے راج کا وزیر مقرر ہوا ہے۔ اور دونوں عمر بھر میں پہلی دفعہ ایکدوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی اپنی نوکری پر گئے۔

اس واقعہ کے ۱۸ سال بعد جب یہ بچے جوان ہو کر بیاہ شادی کے قابل ہوتے، تو بھوری واسو اور دیورت نے اپنے لڑکپن کا عہد پورا کرنا چاہا۔ مگر آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ مالتی اور مادھو کے بیاہ کو ہی لیجئے۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ اسمیں روڑا اٹکیگا لیکن رکاوٹ پیدا ہوئی۔ اور وہ بھی ایسی کہ جس کا کسی کو سان گمان نہ تھا۔ کون جانتا تھا کہ نندن جیسے بڈھے کھوسٹ کو مالتی سے بیاہ کا شوق چرائیگا۔ اور راجہ اپنے ایک اہلکار کی سٹھیائی ہوئی آرزو پوری کرنے کے لئے بہار اور خزاں کو گلے ملانے کا تماشہ دیکھنے پر تل جائیگا۔ راجہ کے اشارہ کرنے کی دیر کہ بھوری واسو کو باچھیں کھلا کر یہ کہنا ہی پڑا۔ "مہاراج وہ آپ کی پتری ہے۔ جسے چاہیں دان کریں۔ خانہ زاد کو تو اپنی جان تک سے دریغ نہیں۔" مگر یہ سب منہ کی باتیں تھیں ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی پیاری بیٹی کو کنوئیں میں دھکیلنے پر راضی ہو جاتا۔ اُسے راجہ کے حکم سے سر پھیرنے کی مجال نہ تھی۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ بلا اُوپر ہی اُوپر ٹل جائے۔ راجہ بھی ناراض نہ ہو اور مالتی کا

بیاہ بھی مادھو سے ہو جاتے۔ آخر اس نے مائی کامندکی کو
سارا قصہ سُنایا۔ اور اس سے پُوچھا۔ کہ اب کیا کیا جائے
مائی کامندکی نے ان دنوں لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے
پدماوتی میں پاٹ شالہ کھولا تھا۔ اور مالتی بھی اس کے
پاس پڑھتی تھی۔ کامندکی نے بھوری واسو کو تسلی دی۔ اور کہا
کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مَیں ایک تدبیر کرتی ہوں۔
اگر کام دیو کی عنایت سے وہ پٹ پڑی تو پو بارہ ہیں۔
پھر اُس نے وزیر کو اپنی تدبیر سمجھائی۔ اور وہ مطمئن ہو کر
گھر گیا۔

بھوری واسو کے جانے کے بعد کامندکی نے
دیورت کو ایک چٹھی لکھی، کہ مادھو کو فوراً پدماوتی بھیجدیا
جائے تاکہ وہ زندگی کا ضروری سبق بھی پڑھ لے۔ دیورت
کامندکی کے اشارے کو سمجھ گیا۔ اور اُس نے مادھو کو
پدماوتی روانہ کر دیا۔ جب مادھو کامندکی کے آشرم میں
پہنچا۔ تو مالتی اور نندن کے بیاہ کی تیاریاں زوروں پر
تھیں۔ اور اس سلسلہ میں مالتی کو اکثر مندر جانا پڑتا تھا۔
ایک دن کامندکی کو پتہ چلا کہ کل صبح مالتی پوجا کے لئے
مندر جائیگی۔ تو اس نے مادھو سے کہا کہ کل مدن دیو کے
مندر میں بڑا بھاری میلہ لگیگا۔ تم بھی جانا اور کہیں بیٹھ کر
سیر دیکھنا۔ دوسرے دن مادھو پو پھٹتے ہی مندر کے
باغ میں جا بیٹھا۔ اور پھول توڑ کر ہار گوندنے لگا۔ مالتی اُس
سے پہلے تاروں کی چھاؤں میں پہنچ چکی تھی۔ اور اب پوجا پاٹ
سے فارغ ہو کر باغ کی سیر کو آ رہی تھی۔ مادھو اور مالتی
نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گھور کر دیکھا۔ مگر اس انداز
سے دیکھا۔ کہ اگر کوئی دیکھتا ہو تو یہی سمجھے کہ انکی آنکھوں نے
کچھ نہیں دیکھا۔ مالتی تو چلی گئی اور مادھو اپنے دل میں
اس کی تصویر اُتارتا رہ گیا۔ اس طرح مائی کامندکی کی تدبیر
کی پہلی منزل کامیابی سے طے ہوئی۔

مادھو اپنی خیالی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ کہ ایک
رسیلی آواز نے اس طلسم کو توڑا۔ وہ چونک پڑا سر اُٹھا کر
دیکھتا ہے تو ایک دوشیزہ کے پیارے پیارے مکھڑے
سے مُسکراہٹ کھل رہی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ
شوخی کا متحرک بُت تھا یا حیا کا چلتا پھرتا پتلا تھوڑی دیر
تک ایک کی شوخی اور دوسرے کی حیرت میں جنگ ہوتی
رہی۔ آخر لڑکی ہی نے زبان کھولی اور کہا۔ "صاحب آپ
نے یہ خُوبصورت ہار جن پھولوں سے بنایا ہے وہ میری
دودھ بہن مالتی کو بہت بھاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ
آپ نے سارے باغ کا عطر نکال کر اس ہار میں رکھ دیا
ہے۔ اور اگر وزیر بھوری واسو کی اکلوتی بیٹی اسے
للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھے تو کون اچنبھے کی بات ہے
ہاں میرا نام! تو جناب داسی کو لونگکا کہتے ہیں۔" مادھو کا
خیال تھا کہ اس کی آنکھ ہی سحر ہے۔ اب اسے معلوم ہوا۔

کہ خیرہ سے زبان بھی جادو سے خالی نہیں۔ وہ چپ تھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر لفظ نہیں ملتے تھے۔ اُس نے پہلے ہار کی طرف دیکھا۔ پھر لونگکا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اور برہم چریہ کی گود سے تازہ تازہ نکلے ہوئے نوجوان کا دماغ اس بات کا فیصلہ کرنے سے عاجز ثابت ہوا کہ ہار اور لونگکا میں سے کون زیادہ خوبصورت ہے۔ اس کی نگاہیں پریشان ہو کر سارے باغ میں پھیل گئیں۔ اور اس عورت کی تلاش میں دوڑنے لگیں۔ جو مادھو کی نظروں میں لونگکا کے حسن کا لاجواب جواب تھا۔

اُنھوں نے مالتی کو پھاٹک کے پاس کھڑے پایا۔

دونوں نے پھر ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ مادھو کی نگاہیں ڈھیٹھ تھیں جمی رہیں۔ مگر مالتی نے آنکھیں جھکالیں ذرا مُنہ پھیر لیا۔ ہاں درست ہے اس لئے تاکہ اُس کے چہرے کی لالی اس کے دل کا راز فاش نہ کردے۔ مگر یہ روک تھام بے سود تھی۔ مادھو تو یہ بات پا چکا تھا۔ کہ مالتی کا دل بھی اس کسک سے بیگانہ نہیں، جس پر اس کا دل لوٹ ہے۔ دونوں کی نگاہوں میں چھُریاں چلنے کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ مادھو نے ہاری مان لی۔ اور ہار لونگکا کے حوالے کرکے ہتھیار ڈال دیتے۔ لونگکا فاتحانہ انداز سے دوڑی دوڑی گئی، اور ہار مالتی کے نذر کیا۔ مادھو کی نگاہیں یہ دیکھ کر پھُولی نہ سمائیں کہ مالتی نے اسے لیکر جھٹ انگیا میں رکھ لیا۔ گویا یہ بھی ایک راز تھا جسے وہ دل میں بند کرنا چاہتی تھی۔ مالتی اور لونگکا پھُولوں کی باس کی طرح باغ سے نکل گئیں اور مادھو کی نگاہ میں ساری فضا پر اوس پڑ گئی۔ وہ اپنے دل کو خیال کے کھلونوں سے بہلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کہ اس کا دوست مکراندا آنکلا۔ مادھو نے اسے سارا ماجرا سُنایا۔ تو وہ سنّاٹے میں آگیا۔ اور اس آرزو کے راستہ میں ہزاروں کانٹے نظر آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نندن سے مُنہ لگے اہلکار کے مقابلہ میں مادھو کی وہی بساط تھی جو راجہ بھوج کے سامنے گنگا تیلی کی ہوسکتی ہے۔ ہاں ہار کا معاملہ ایسی بات تھی جہاں پانی مرتا تھا۔ اور جس کی اوٹ میں امید آنکھ مچولی کھیلتی تھی۔ اس کا دماغ معاملہ کی اُونچ نیچ کی ادھیڑ بن میں پھنسا تھا کہ مکراندا کا نوکر کالاہسا آگیا۔ اور اُس نے اپنے آقا کو ایک تصویر دکھائی۔ مکراندا نے تصویر دیکھی، تو چلّا اُٹھا۔ "مادھو کی تصویر! کس نے اُتاری! انہیں کہاں سے ملی؟"

کالاہسا مکراندا کا پُرانا نوکر اس کے بہت مُنہ چڑھ گیا تھا۔ بے تکلفی سے بولا۔ "اجی کس نے اُتاری اُس نے جس کی تصویر مادھو جی اپنے دل میں چھپائے بیٹھے ہیں۔ ملی کہاں سے، تو اس کا قصّہ سُننے بائی جی

کی داسی مندریکا نے لونگکا سے لی اور اس سے ذرا میں مانگ لایا۔ بات یہ ہوئی کہ مادھو جی کسی دن گھومتے گھامتے مالتی کے محل کے پاس گزرے۔ مالتی جھروکہ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے آپکی شکل پسند آئی۔ اور کاغذ پر اتار لی بس" یہ سنکر مکراندا نے مادھو سے کہا۔ کہ "اب ایک کام کرو تم بھی مالتی کی تصویر اتار کر اس کے پاس بھیجدو۔" بہت اصرار کے بعد مادھو نے قلم اٹھایا اور چند منٹوں میں مالتی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ مکراندا نے دیکھ کر کہا۔ "اوہو! یہ تو ہو بہو مالتی ہے۔ صرف بولنے کی کسر ہے۔" اتنے میں داسی مندریکا آئی اور کالاہسا سے تصویر مانگنے لگی۔ اس نے وہی تصویر دیدی، جو مادھو نے ابھی ابھی تیار کی تھی۔ مندریکا اسے دیکھ کر بھچک رہ گئی۔ مگر جب کالاہسا نے اسے تصویروں کو تبدیل کرنے کا مطلب سمجھایا تو وہ بھی خوشی سے اس ملی بھگت میں شریک ہو گئی۔ اور مالتی کی شبیہ کو لیکر لونگکا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اب وہاں اور ٹھہرنا بیکار تھا۔ اس لئے مکراندا اور مادھو بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

لونگکا کو تصویر ملی تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی جھٹ مالتی کے پاس لے گئی۔ تصویر کی آڑ میں نندن کو خوب جلی کٹی سنائیں۔ اور مادھو کے خیال کو پکے پاؤں مالتی کے دل میں جما دیا۔ اس طرح مائی کا سندکی کی تدبیر کی دوسری منزل بھی ختم ہو گئی۔ چند دن گزرنے کے بعد مائی نے مناسب خیال کیا۔ کہ لگے ہاتھوں مالتی اور مادھو کا ایک اور ملاپ ہو جائے۔ اس نے مالتی کو شیوجی کی مورتی پر پھول چڑھانے کی ہدایت کی۔ اور یونہی باتوں باتوں میں یہ بات مادھو کو جتا دی۔

دوسرے دن مالتی ٹوکری میں پھول ڈالکر مائی کے ساتھ شوالہ کو چل پڑی۔ مادھو پہلے ہی سے جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر باہر آنے لگا تو مائی نے اشارہ سے روک دیا۔ اور مالتی سے مادھو کی باتیں کرنے لگی۔ جن کے جواب میں مالتی کو کہنا ہی پڑا کہ سارے سنسار میں مادھو ایک نوجوان ہے۔ جس میں آدمی کی ساری اچھائیاں پائی جاتی ہیں۔ مادھو مزے لے لے کر یہ شربت کے گھونٹ پی رہا ہے کہ یکایک ہلڑ مچا۔ کہ ایک شیر پنجرے سے چھوٹ گیا ہے۔ اور سٹھراؤ کرتا چلا آ رہا ہے۔ ابھی اس خبر کی دہشت ان کے دلوں کو پورے طور پر دہلانے نہ پائی تھی کہ مائی کی ایک داسی چیختی چلاتی آئی کہ "ہے ہے شیر نندن کی بہن اور مالتی کی سہیلی مندریکا کو دبوچا چاہتا ہے۔ نگوڑی ہزار جان سے دوڑ رہی ہے پر خیر نظر نہیں آتی۔ ہے ایشور! اب کیا ہوگا۔ کوئی نہیں جو اس آڑے وقت میں اس کے کام آئے۔ شیر مالتی کی سہیلی پر حملہ

کرے۔ اور مادھو نچلا بیٹھا رہے۔ ناممکن تھا۔ اس نے بجلی کی طرح جھاڑیوں کی گھنگھور گھٹا سے نکلکر شیر پر دھاوا بول دیا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے مکراندا شیر کے مقابل ہو چکا تھا۔ اور دونوں میں چوٹیں چل رہی تھیں شیر مکراندا کو دبائے چلا جاتا تھا۔ مگر مادھو کے کھانڈے نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا۔ اور اب شیر کو ہار ماننا پڑی۔ اُنہوں نے چند منٹوں میں شیر کو تکہ بوٹی کر ڈالا۔ مگر خود بھی زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بیشک حیا عورت کا سب سے قیمتی زیور ہے۔ اور اسی سے اس کا سہاگ قائم رہتا ہے۔ اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ وہ حیا پر حیات کو قربان کر دینے اور ان پر جان نچھاور کرنے کو کھیل سمجھتی ہے۔ مگر جو نقشہ مالتی کے سامنے تھا اسے دیکھ کر تو مردوں کا کلیجہ پانی ہو کر بہ جاتے۔ وہ تو عورت ذات تھی۔ آخر کہانتک ضبط کرتی۔ اور اُسے یوں خاک پر تڑپنے دیتی جس نے اس کی سہیلی کے لئے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا۔ جب مالتی سے نہ رہا گیا تو اُس نے بڑھ کر بیہوش مادھو کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور اس کے ہاتھ سہلانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مادھو کو ہوش آ گیا۔ مگر وہ چاہتا تھا کہ اس کے ہوش بار بار گم ہوں اور ہر بار مالتی انہیں ڈھونڈ لائے۔ اس کی آرزو تھی۔ کہ یہ روگ طول میں مالتی کے بالوں سے بھی دو ہاتھ آگے

رہے۔ اور تیمار داری کے نشہ کا تار ٹوٹنے میں نہ آتے مکراندا کے گھاؤ بھی خالی نہ گئے۔ اور مدنیکا کے دل میں گھر کر کے رہے۔ یہ سب کچھ تو ہُوا۔ لیکن مالتی اور مادھو کی شادی میں جو رکاوٹیں پیدا ہوئی تھیں جوں کی توں کھڑی تھیں۔ اور ان کے رفع ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ہر طرف سے نراس ہو کر مادھو نے جی میں ٹھان لی۔ کہ جو ہو سو ہو وہ بھوتوں پریتوں سے مدد لیگا۔ اور راجہ کے سر پر جو نندن کے بیاہ کا جن چڑھا ہے اسے اُتاریگا۔

سیاہ کالی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان نے چاند تاروں کے غم میں ماتمی لباس پہنا ہے۔ ہو کا عالم تھا۔ اور انتہا کی سنسانی تیز ہوا کے تند جھونکے اس خوفناک منظر کو اور زیادہ ہولناک بنا رہے تھے۔ یہ سماں تھا جب مادھو نے شمشان بھومی میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔ اور ڈر کے مارے دونوں کانپ رہے تھے۔ مادھو جیوٹ سپاہی کیا جانے کہ ڈر کس جانور کا نام ہے۔ مگر اس نقشہ نے اسے بھی بزدلی کا زرد زرد چہرہ دکھا دیا۔ بھوت گوشت کی بو سونگھ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور اپنی کان پھاڑ چیخوں سے فضا میں لرزا پیدا کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ مادھو

ان کی چیخ پکار کے بھڑیے میں آ جائیگا۔ مگر جب اس پر کچھ اثر نہ ہُوا تو وہ چھینا جھپٹی پر اُتر آئے۔ مادھو نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ اور بڑھے چلا گیا۔ تا کہ جلتی ہُوئی چِتا کے سرہانے کھڑے ہو کر انہیں گوشت کی بھینٹ دے اور مدد کا وعدہ لے۔ اچانک کسی عورت کی ایک دردناک چیخ سے چونک اُٹھا۔ کان لگا کر سُنتا ہے تو کالی کے مندر سے مالتی کی فریادوں نے تانتا باندھ دیا۔ دُنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ اسے کچھ سدھ نہ رہی۔ کہ وہ کیوں ایسی کٹھن جگہ میں آیا تھا۔ بس پھر کیا، گوشت کو زمین پر پٹک اور تلوار سونت کر مندر میں جا گھسا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہے کہ مالتی زمین پر بیہوش پڑی ہے۔ اور کالی کا ایک پجاری جس کا نام اگھوڑ گھنٹ تھا۔ اس کے سر پر تلوار تول رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ ایک ہی وار میں بھٹا سا سر اڑا کر اسے دیوی کی بھینٹ چڑھائے۔ کہ اس کی شاگرد وہ کپال کنڈلا کے جادو میں کامل ہونے میں صرف یہی شرط باقی تھی۔ مادھو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیہوش مالتی کو گود میں اُٹھا کر مندر سے باہر لے آیا۔ اتفاق سے جو آدمی اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے ادھر آ نکلے۔ اور مادھو، مالتی کو ان کے حوالہ کر کے اگھوڑ گھنٹ کی طرف متوجہ ہُوا۔ جو غصّہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ اور

اس کے تعاقب میں چلا آتا تھا۔ پجاری کھانڈا کھینچ کر ٹوٹ پڑا۔ مادھو بھی پُورا پھکیت اور منجھا ہُوا لڑنتیا تھا۔ اس نے بھی سردہی کے وہ ہاتھ دکھلائے۔ کہ پجاری کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ آخر مادھو نے ایسا بھرپور وار کیا کہ پجاری کا بھنڈارا کھل گیا۔ اور اس کی لاش مندر کے دروازے پر تڑپنے لگی۔ کپال کنڈلا نے اپنے گرو کی یہ گت دیکھ کر ماتم شروع کیا۔ دوہتڑ چلانے لگی۔ سر کے بال نوچ ڈالے۔ اور مادھو کو دل کھول کر کوسنے سُنائے۔ جب اس سے بھی سیری نہ ہوئی۔ تو کالی کی مورتی کے سامنے جا کر انتقام کا پرن کیا۔ مادھو اپنی آخری تدبیر کو چوپٹ پڑتے دیکھ کر دل ہار بیٹھا اور مرجھایا ہُوا چہرہ لیکر گھر کو گیا۔

دوسرے دن مادھو نے سُنا کہ مالتی شوالہ کو پوجا کے لئے جا رہی ہے۔ اور وہیں وہ سہاگ کا جوڑا پہنیگی جو راجہ نے اسے بھیجا تھا۔ مادھو نے یہ خبر مکرندا کو سُنائی اور دونوں سر دھننے لگے۔ کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر سوچتے سوچتے مکرندا کو ایک عجیب بات سُوجھی۔ اور ڈوبتے ہُوئے مادھو کو یہ تنکا کا سہارا بھی غنیمت معلوم ہُوا۔ مگر اس تجویز کا پُورا ہونا لونگکا کی شرکت پر منحصر تھا۔ اور اُنہیں اندیشہ تھا۔ کہ کہیں وہ اس سازش میں شریک ہونے سے انکار نہ کر دے۔ آخر بڑے اصرار کے بعد

مائی کامند کی کے کہنے سننے پر اس نے ہامی بھر ہی لی۔ جب اس کی طرف سے خاطر جمع ہوئی تو انہوں نے پجاریوں کو رشوت دے کر اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئے کہ مکراندا شیو جی کی مورتی کے پیچھے چھپ کر دیکھ لے کہ نئی نویلی دلہن کیسے پوجا کرتی ہے۔ مکراندا مورتی کے پیچھے اور مادھو کسی اور جگہ چھپ گئے تو مالتی اور لونگکا آئے۔ مالتی کی وہ چال جو کبھی چکور کو شرماتی تھی آج کسی بیمار کی رفتار معلوم ہوتی تھی۔ اس کا کنول روپ چہرہ باسی ہاروں سے بھی زیادہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن سے پتہ لگتا تھا۔ کہ اس کے کلیجہ پر کیا چھریاں چل رہی ہیں اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے سینہ میں تن من کو جلانے والی بھٹی سلگ رہی ہے لونگکا نے مالتی کی طرف سے مورتی پر پھول چڑھائے۔ ارتھی کی رسوم پوری کی اور نظر اٹھا کر دیکھا تو مالتی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر زار زار رو رہی تھی۔ لونگکا تو موقع کی تاک میں تھی۔ اس نے جھٹ مادھو کو اشارہ کیا۔ اور وہ سہاگ کا جوڑا پہن گھونگٹ نکال کھڑا ہو گیا مکراندا کی شکل ایسی پیاری پیاری اور نک سک ایسا زنانہ تھا کہ کوئی شخص اس کی چھب تختی دیکھ کر گمان نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مرد ہے۔ اتنے میں مالتی نے ایک ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹایا۔ مادھو کا گندھا ہوا ہار نکالا اور یہ کہکر لونگکا کے گلے میں ڈالنا چاہا۔ کہ مادھو کی محبت کی یہ نشانی اسے لوٹا دینا کہ وہ اب اس کے قابل نہیں رہی۔ مگر وہ ہار بجائے لونگکا کے مکراندا کے گلے میں جا پڑا۔ کیونکہ اب اس کی جگہ مکراندا کھڑا تھا۔ مالتی کو اپنی بھول معلوم ہوئی تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ دھیمی سی آواز سے لونگکا کو پکارا وہ تو نہ آئی۔ مگر اس کی بجائے مائی کامند کی مادھو کو ساتھ لئے برآمد ہوئی۔ اور اس نے مالتی کا ہاتھ مادھو کے ہاتھ میں دیکر سارا قصہ سنایا۔ کہ کس طرح ان کی منگنی ہوئی تھی پھر وہ انہیں اپنے آشرم کے باغ میں لے گئی۔ اور بیاہ کی رسمیں ادا کر کے انہیں کہا۔ کہ جہاں سینگ سمائیں نکل جاؤ۔

اب مکراندا کا حال سنئے۔ اس نے گھونگٹ کی آڑ لیکر دلہن کے سب کام انجام دئے۔ اور برات کے ساتھ نندن کے گھر پہنچا۔ جب رات خاصی بھیگ گئی تو نندن اپنی دلہن کے پاس آیا۔ مکراندا نے پہلے تو ناز نخرے میں نندن کو خوب بنایا۔ اور جب اس نے گھونگٹ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے زور سے دھکا دیا کہ بیچارا لڑھکنیاں کھاتا ہوا کہیں کا کہیں جا پڑا۔ وہ اپنی دہان پان دلہن کی یہ گاؤ زوری دیکھ کر نیلا پیلا ہو گیا۔ مگر دم نہ مارا

کیونکہ وہ جوتی ہاتھ میں لے کر کفش کاری کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کپڑے جھاڑ کر کھسیانی بلی کی طرح دبے پاؤں باہر نکلا۔ اور سیدھا اپنی بہن مدنیدکا کے پاس گیا۔ اور رو رو کر اپنا دُکھڑا سنایا۔ نند کو بھاوج کے یہ کوتک نرالے معلوم ہوئے۔ بھلا شریفوں کی بہو بیٹیوں کو ڈھول دھپے سے کیا علاقہ۔ پھر بھی وہ اپنے بھائی کی یہ گت ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ سکی۔ اور یہ ٹھان کر چلی کہ بھاوج کے بل نکلنے کی طرح نکال کر رکھ دیگی۔ دلہن کے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو لونگکا پہلے سے موجود کھڑی تھی۔ اس سے مالتی کی شکایت شروع کی۔ اس نے بات سے بات نکال کر مکراندا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہا کہ ایسے چاہنے والے نصیبوں سے ملا کرتے ہیں۔ جو کسی کے لئے جان پر کھیل جانے کو تیار رہوں۔ مدنیدکا کو کیا خبر کہ مکراندا کان لگائے ان کی سب باتیں سن رہا ہے۔ اس نے سیدھے سبھاؤ سے اپنے دل کی لگی بیان کی اور کہا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں کہ پھر انکے درشن ہوں۔ لونگکا نے پوچھا اچھا ہوا اگر وہ تمہیں مل جائیں تو کیا کرو۔ مدنیدکا نے لجا کر جواب دیا کیا کروں! واہ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے لونگکا نے کہا۔ تو میں بھولی نہیں پوچھتی۔ مگر اتنا تو بتا دو کہ اگر وہ تمہیں اس طرح لے کر نکل جائے جیسے کرشن مہاراج رکمنی کو لیکر چل دئے تھے تو پھر۔ بولی کہ بھگا لے جانے کی ایک رہی کہی۔ اس کی کیا ضرورت ہے وہ ذرا اشارہ کر دیں تو یہ من مول کی داسی ان کے قدموں لگی پھرے۔ یہ باتیں کرتے کرتے وہ کمرے میں داخل ہوئیں اور دلہن کے پلنگ کے پاس جا پہنچی۔ مدنیدکا نے کہا۔ مالتی سو رہی ہو کیا، اُٹھو نا ذرا باتیں کریں۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جگانے لگی۔ ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ مکراندا نے اس کا پونچا پکڑ لیا مدنیدکا کی نازک نازک کلائی بل پہ بل کھانے لگی۔ اور کئی چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ جب ہزار جتن سے بھی کلائی اس کی گرفت سے نہ نکلی تو مدنیدکا چلائی۔ ارے کوئی دوڑیو یہ مالتی نہیں کوئی چالیا مردوا ہے۔ لونگکا نے ہنس کر کہا۔ جی ہاں مردوا ہے مگر وہی جس کے لئے مری جا رہی ہو۔ ذرا آنکھیں کھولکر دیکھو تو کون ہے۔ مدنیدکا نے غور سے دیکھا تو مکراندا مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی ہنس پڑی اور لونگکا نے ان کو ملا کر کہا۔ کہ اب جلد چلو۔ اور مالتی اور مادھو کے پاس پہنچ جاؤ۔

مادھو مالتی کے پہلو میں ایک پہاڑی پر بیٹھا مزے سے جھیل کی سیر کر رہا تھا۔ اور مالتی مادھو کے گندھے ہوئے ہار کو پھر گلے میں ڈالے اس سے کھیل رہی تھی۔ کہ لونگکا۔ مدنیدکا اور کالا ہمسا گھبرائے ہوئے آئے۔ اور انہیں بتایا کہ نندن کے سپاہیوں نے مکراندا کو پکڑ لیا۔ اور اسے

گھسیٹے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ یہ سُنکر مادھو کو تاب کہاں، کالا ہمسا کو ساتھ لیکر دوڑا۔ اور سپاہیوں سے سر مکھ ہو کر لڑنے لگا۔ تھوڑی دیر میں سپاہی میدان چھوڑ گئے۔ اور وہ مکراندا کو ساتھ لیکر جانے کو تھے کہ راجہ کا چوبدار انہیں لینے کے لئے آیا۔ جب مادھو اور مکراندا دربار میں پہنچے تو نندن اور بھوری واسو نے انہیں زہر بھری نگاہوں سے دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ان کا بس چلتا تو دونوں کو کچا چبا جاتے۔ لیکن راجہ کا تبسّم ان کے استقبال کے لئے بڑھا۔ اور اس نے بھوری واسو کو مخاطب کر کے کہا۔ کہ راج کو ایسے ہی منچلے سورما سپاہیوں کی ضرورت ہے۔ راجہ کے مُنہ سے یہ لفظ نہ نکلے بلکہ کمان سے ایک تیر چھوٹا جو نندن کے دل پر بیٹھا۔ اور اس کی آرزوؤں کا خون کر گیا۔ اس کے سینہ پر سانپ لوٹ گئے۔ مگر کرتا تو کیا کرتا۔ دانت پیس کر اور زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ بھوری واسو کا غُصّہ تو نرالا کھا وا تھا۔ اسے راجہ کی مہربانی میں اپنی مُنہ مانگی مراد کی جھلک نظر آئی۔ راجہ نے دونوں کو خلعت دیکر رخصت کیا۔ اور وہ فتح کے پھریرے اُڑاتے وہاں سے لوٹے۔ کالا ہمسا یہ خوشخبری لیکر بھاگا بھاگ جھیل کے کنارے پہنچا۔ مگر وہاں اور ہی گل کھلا تھا۔ مالتی گم تھی اور مدنیکا اور لونگکا اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مادھو اور مکراندا بھی پہنچے۔

مادھو نے جب مالتی کو وہاں نہ پایا تو چھوٹتے ہی پوچھا کہ یہ تو کہو مالتی کہاں ہے۔ مدنیکا نے بھرائی ہُوئی آواز سے جواب دیا کہ "جب آپ کے آنے میں ذرا دیر ہو گئی تو مالتی گھبرا کر پہاڑی سے نیچے اُتری۔ اور آپ کی راہ دیکھنے لگی۔ پس پھر اب تک لوٹ کر نہیں آئی"۔ مادھو تو کپال کنڈلا پر شک ہُوا کہ ہو نہ ہو وہی مالتی کو اگھور گھنٹ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اڑا لے گئی ہے۔ مادھو تو غم کے مارے سڑی سودائیوں کی سی باتیں کرنے لگا اور مکراندا نے دم دلاسے کی باتیں شروع کیں۔ صرف ایک لونگکا تھی جس کے اوسان بجا تھے۔ وہ مائی کامندکی کے پاس گئی اور اسے ساری بپتی سُنائی۔ مائی کی ایک شاگردہ کو جس کا نام سدہامنی تھا۔ جادو میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مائی نے اس سے مدد مانگی۔ اور وہ فوراً ہوا میں اُڑ کر کپال کنڈلا کو ڈھونڈنے چل پڑی۔ کیونکہ اسے جادو کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ یہ ساری اسی کی کارستانی ہے۔ اور وہ کالی کے مندر کے پاس ایک پہاڑی پر مالتی کو دیوی کی بھینٹ چڑھایا چاہتی ہے۔

سدہامنی اور کپال کنڈلا کا آمنا سامنا ہُوا۔ اور دونوں طرف سے جادو کے بان چلنے لگے۔ بڑی سخت جنگ کے بعد آخر کپال کنڈلا ماری گئی اور سدہامنی نے

فتح کی نشانی یعنی مالتی کو کامندکی کے پاس پہنچایا جو بیہوشی میں بھی مادھو کا نام رٹتے جاتی تھی۔ سدہامنی نے اسے وہاں چھوڑا اور آپ مادھو کی تلاش میں چلی۔ تھوڑی دیر میں وہ مل تو گیا مگر ایسی حالت میں گویا گھڑی ساعت کا مہمان ہے بمکراندا بھی پاس کھڑا پہاڑی سے کود کر خودکشی کرنے کے لئے کندھے تول رہا تھا۔ سدہامنی نے اسے وہ ہار دکھایا جو مادھو نے مالتی کو دیا تھا۔ اور اُسے یقین دلایا کہ مالتی زندہ مل گئی ہے۔ اور مائی کامندکی کے آشرم میں چنگی بھلی موجود ہے۔ اب سدہامنی یہ سوچنے لگی۔ کہ مادھو کو کیسے ہوش میں لائیں۔ مکراندا نے کہا اس کی فکر بیکار ہے۔ یہ ہار اس کے گلے میں ڈال دیجئے۔ ہزار نخلخوں کا کام کریگا۔ ہار گلے میں پڑنا تھا کہ مادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ اور جب اسے معلوم ہوا۔ کہ مالتی نزدیک ہی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تو وہ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ سدہامنی اور مکراندا مادھو کو ساتھ لیکر آشرم میں آئے۔ مالتی اور مادھو کا ملاپ ہوا۔ اور وہ اس خوشی میں اپنے سارے غم بھول گئے۔ مدنیکا اور لونگکا بھی آ گئے۔ اور سب نے ملکر بدھ دیو کا شکر ادا کیا جن کی مہربانی سے مشکلوں کے تمام پہاڑ پانی ہو کر بہ گئے اتنے میں ایک چوبدار آیا۔ اور اس نے یہ حکم سُنایا۔ کہ راجہ نے مادھو اور مالتی۔ مکراندا اور مدنیکا کی شادی کی منظوری دیدی ہے۔ کامندکی نے مکراندا اور مدنیکا کی شادی کی رسمیں ادا کر دیں۔ اور سب خوشی سے ہنستے بولتے اپنے اپنے گھروں کو سدہارے۔

نور الٰہی
و
محمد عمر

نوٹ

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف
جواب طلب خطوط کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ ضرور ساتھ آنا چاہئے۔ "مینجر"

نور جہاں

خدائی نیند میں سرشار ہے، برکھا کا موسم ہے
زمینِ شہدرہ پر ہر طرف کھویا سا عالم ہے

افق پر منتشر، مہتاب کی سرشار لہریں ہیں
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندی کی نہریں ہیں

نقابِ آسماں میں ننّھے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زرّیں کھلکھلاتے ہیں

غبارِ مرمریں سا اُڑ رہا ہے صحنِ ہستی سے
ہوا کی پیالیاں لبریز ہیں پھولوں کی مستی سے

چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
کہ پریوں نے کہیں موتی بکھیرے ہیں پرستاں میں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے

رسیلی بو کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرو سوسن پر
نشہ کا سا سماں چھایا ہوا ہے سارے گلشن پر

پرندے سو چکے ہیں جا کے اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں

خموشی کا سماں اِک ہو کا عالم ہے زمانے پر
سکوں طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانہ پر

نہا کر آئی ہیں اندر کی حوریں عطر کے جل میں
نشہ کی موجیں اُڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں

سکونِ شب سے ہیں ٹھہری ہوئی پانی کی نہریں بھی
کہیں گہرائیوں میں سو چکی ہیں جا کے لہریں بھی

روپہلی رات پر طاری ہے اندوہِ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لیٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی

زمین و چرخ نے چپ سادھ لی ہے ہر صدا چپ ہے
اِدھر اُجلی فضا چپ ہے اُدھر ٹھنڈی ہوا چپ ہے

یہ بھیگی رات یہ مستانہ رُت یہ نور کا عالم
زمرّد فام نخلستاں پہ برقِ طور کا عالم

ہوا سے ننّھی کرنیں کھیلتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں جھولتی ہیں سبزہ زاروں پر

اسی سنسان نخلستاں میں اِک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اِک شہنشاہِ گرامی کی محبت ہے

یہاں وہ بانوئے عفت نشاں سوتی ہے تربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں

ادب! اے دل ادب کر! روضۂ نورِ جہاں ہے یہ!

مقدس خوابگاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ!
(بعض تصوّراتِ تاریخی)

کوئی زائر جب اس کے مرقد انور پہ جاتا ہے
تو اس کو سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے

جب اس کا باپ نکلا تھا وطن سے بے وطن ہو کر
چلا تھا پھول صحرا کی طرف زیبِ چمن ہو کر

نکلکر ملک سے اپنے وہ جب قندھار تک پہنچا
لئے بیگم کو ساتھ اِک وادیٔ پُرخار تک پہنچا

تو اس ہیبت فزا جنگل میں اِک دختر ہوئی پیدا
قمر کی گود سے اِک زہرۂ انور ہوئی پیدا

مگر ماں باپ پر قسمت نے ایسا وقت ڈالا تھا
کہ دل میں درد تھا آنکھوں میں آنسو لب پہ نالہ تھا

پریشانی کے بادل چھا رہے تھے ان کی حالت پر
غم و حسرت کے دریا موجزن تھے ان کی صورت پر

نہ سوجھی جب کوئی تدبیر انہیں اس کی حفاظت کی
تو رکھ لی ہار کر چھاتی پہ سِل دونوں نے فرقت کی

لٹا کر چل دئے دونوں اسے سبزہ کے بستر پر
ستارے رو رہے تھے خون اس غمگین منظر پر

کہ یوں لختِ جگر کو چھوڑ کر جاتا نہیں کوئی
ذرا سی جان کو بے دودھ تڑپاتا نہیں کوئی

وہ دختر کون تھی؟ اے ملکۂ نورِ جہاں تو تھی!
وہ بیکس کون تھی؟ اے زینتِ ہندوستاں تو تھی!

مگر تقدیر کے آگے کسی کی چل نہیں سکتی
مسرت مٹ نہیں سکتی، مصیبت ٹل نہیں سکتی

یکایک رحمتِ خلاقِ باری جوش میں آئی
دلِ قدرت میں بندوں کی محبت ہوش میں آئی

صدا سُنکر تری رونے کی اِک سردار آ پہنچا
عقب سے قافلہ کا قافلہ سالار آ پہنچا

محبت سے وہ گودی میں اُٹھا کر لے گیا تجھ کو
تو گویا مر چکی تھی وہ جلا کر لے گیا تجھ کو

تری معصوم قسمت نے بھی کی پھر یاوری تیری
ہوئی تفویض تیری ماں کو ہی دایہ گری تیری

حکومت نے نوازا اور بخشا مرتبا اس کو
خطاب اعتماد الدولہ اکبر سے ملا اس کو

غرض تو پرورش پانے لگی قصرِ حکومت میں
بسر ہونے لگی طفلی کی دنیائے مسرت میں

یونہی آ پہنچی جب طفلی تری حدِ جوانی میں
شباب اِک موج بنکر اُٹھا بحرِ زندگانی میں

تو شادی کر دی شاہنشہ نے تیری شیر افگن سے
خوشی کا غلغلہ اُٹھا نوا سنجان گلشن سے

مگر کچھ دن میں لایا رنگ یہ چرخ کہن آخر
کہ درہم ہو گئی تیری خوشی کی انجمن آخر

زمانہ نے لباس بیوگی پہنا دیا تجھ کو
مسرت زار سے غم خانہ میں پہنچا دیا تجھ کو

نگاہوں سے تصوّر پھر نیا پردہ اُٹھاتا ہے
تجھے ملکہ بنا کر قصر شاہی میں بلاتا ہے

جہانگیر اک طرف مصروف ہے صہبا پرستی میں
لگائے ساغر مے لب سے ہے، سرشارِ مستی میں

ادھر مشغول ہے تو انتظام ملک و دولت میں
امور سلطنت میں اور مہمات سیاست میں

حکومت کر رہی ہے عقل و دانش کے سہارے پر
مدبر ناچتے ہیں تیرے اک ادنےٰ اشارے پر

کچھ اس انداز سے چھیڑا حکومت کے ترانے کو
شہنشہ کی ضرورت ہی نہیں گویا زمانے کو

یہ نیرنگ تصوّر ہے کہ اک خوابِ پریشاں ہے
فضائے شہدرہ میں جیسے نواب بھی خراماں ہے

جلو میں تیرے کمسن لڑکیاں زہرہ شمائل ہیں
زمیں کو آنکھوں آنکھوں میں اُلٹ دینے پہ مائل ہیں

یہ پریاں ہیں جو بہرِ سیر نکلی ہیں پرستاں سے
کہ کچھ حوریں اُتر کر آ گئی ہیں باغ رضواں سے

بلا کی شوخیاں ہیں ان پریوش نازنینوں میں
ہزاروں بجلیاں بھر دی ہیں گویا آبگینوں میں

یہ کمسن حسن کی چڑیاں مگن ہیں رنگ رلیوں میں
کہ تیرے سحر لب سے پڑ گئی ہے جان کلیوں میں

بہار آئیں فضا میں گونجتے ہیں قہقہے ان کے
خمار آگیں ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں قہقہے ان کے

کبھی یہ کھیلتی ہیں آکے راوی کے کناروں پر
کبھی یہ لوٹتی ہیں بیخودی میں سبزہ زاروں پر

زمیں پر ہے شراب حسن کا طوفان سا برپا
جہاں میں ہے بہار ناز کا ہیجان سا برپا

برس جاتی ہیں پنکھڑیاں وہ جس دم بات کرتی ہیں
لبوں کی سرخ قینچی سے ہزاروں گل کترتی ہیں

دو لعل آبدار و صد ہزاراں گل چکا نیدہ
دو چشم کیف بار و صد ہزاراں دل چکا

تصور اس تماشا زار میں جی بھر کے رونے دے
مجھے اک اک کرن کے تار میں موتی پرونے دے

یکایک دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدلتا ہے
نیا عالم نکلنے پر نیا عالم نکلتا ہے

ادھر تو اور جہانگیر اک طرف خاموش بیٹھے ہیں
شراب عشق سے سرشار ہیں مدہوش بیٹھے ہیں
ترے ہاتوں میں اک زرین جام نور افشاں ہے
کہ آغوش سحر میں ایک خورشید درخشاں ہے
کبھی تو بھر کے پیالہ اپنے ہاتوں سے پلاتی ہے
کبھی حالت پہ اس کی چپکے چپکے مسکراتی ہے
دل مخمور میں ارمان اب باقی نہیں کوئی
کہ جنت میں بھی تجھ سا نازنیں ساقی نہیں کوئی
کبھی مدہوش سلطاں دیکھتا ہے پیار سے تجھ کو
نگاہ حسرت آلود و تمنا بار سے تجھ کو
نظر ملنا ترا وہ جھیپ کر گھبرا کے رہ جانا
لجاکر آنکھ نیچی کر کے وہ شرما کے رہ جانا
عبث بدنام کیوں دنیا میں اس کی مے پرستی ہے
شہنشہ جس سے ہے مخمور وہ کچھ اور مستی ہے
وہ مستی کیا ہے تیرے دیدۂ میگوں کی سرشاری
یہیں سے ملتی رہتی تھی اسے تعلیم میخواری

تخیل اس تماشا زار میں کروٹ جو لیتا ہے
تصور ہاتھ سے ماضی کا دامن چھوڑ دیتا ہے

تو میں ہوتا ہوں تنہا اور تیری قبر ہوتی ہے
دل غم آشیاں کو جستجوئے صبر ہوتی ہے
اسی حالت میں اپنی آنکھ سے موتی لٹاتا ہوں
تری سرکار میں کچھ دکھ بھرے نغمے سناتا ہوں
کہ تیرے غم میں ہیں ٹھنڈی ہوائیں بیقرار ابتک
تری فرقت سے ہیں باغوں میں لالے داغدار ابتک
یہاں کی ہر کلی ہر پھول اک تصویر ہے تیری
تو ہے اک خواب اور یہ گل زمیں تعبیر ہے تیری
تری راتیں ابھی تک سو رہی ہیں سبزہ زاروں میں
تری باتیں ابھی تک گونجتی ہیں جوئباروں میں
جو خوشبو کھیلتی رہتی تھی اک دن تیرے کاکل سے
وہی اب چھلکی پڑتی ہے یہاں کے لالہ و گل سے
چمن بکھرا ہوا اک خواب تیری زندگانی کا
کلی بگڑا ہوا اک نقش تیری نوجوانی کا
ادیبوں کی زباں پر آج تک تیرے فسانے ہیں
لب شاعر پہ ابتک تیری مدحت کے ترانے ہیں
تیری فطرت کسی کے ذہن میں آہی نہیں سکتی
ہماری فکر اس کو حشر تک پا ہی نہیں سکتی

تری موزونیِ طبع خداداد ایسی دولت تھی
جسے سُن سُن کے خود تخئیل انسانی کو حیرت تھی

جہانِ بذلہ سنجی میں بپا ہے اضطراب ایسا
رہیگا یاد محشر تک سوال ایسا جواب ایسا

نہیں دیکھا کسی نے آجتک ساری خدائی میں
کہ شوہر کی جگہ بیوی نے لی ہو بادشاہی میں

مگر تو ایسی دانا اور دور اندیش عورت تھی
کہ ہندوستاں کے ہر گوشے پہ تیری ہی حکومت تھی

تری تیمار داری کرتی تھی بیمار کو اچھا
مریضِ عشق اس شاہنشہ میخوار کو اچھا

ترے آگے دلیروں کی دلیری سرد ہو جاتی
تری تلوار سے شیروں کی شیری سرد ہو جاتی

ترے دیدار کا ہے منظروں میں اضطراب اب تک
زمیں کا ذرّہ ذرّہ دیکھتا ہے تیرے خواب ابتک

تری خوشبو جھلکتی ہے ابھی تک غنچہ زاروں میں
ترے نغمے مچلتے ہیں ابھی تک جوئباروں میں

تو روتی تھی تو ساری کائنات آنسو بہاتی تھی
تو ہنستی تھی تو فطرت مُسکرا کر لوٹ جاتی تھی

تو سوتی تھی تو ساتوں آسماں کو نیند آتی تھی
تو اُٹھتی تھی تو کل خوابیدہ دُنیا کو اٹھاتی تھی

غمستانِ جہاں میں تو مجسم اِک تبسم تھی
سکوت آباد ہستی میں سراپا اِک ترنم تھی

ترے جلوے ہیں وجہِ زینتِ چشمِ بشر ابتک
غبارِ قبر تیرا رونقِ اہلِ نظر اب تک

نوازارِ جہاں میں تو وفا کا ساز تھی گویا
کہ سازِ عشق کی اِک جاندار آواز تھی گویا

سپہر حکمرانی کا تجھے ماہ مبیں کہتے
حکومت کی جہاں افروز خاتم کا نگیں کہتے

دلِ غمدیدہ کے حق میں تو اِک سازِ مسرت تھی
جہانگیر ابن اکبر کا تو اک خواب محبت تھی

تری نکہت سے پتہ پتہ جنگل کا لہکتا تھا
تری خوشبو سے قطرہ قطرہ راوی کا مہکتا تھا

تجھے باغ حرم کی بلبل رنگیں نوا کہتے
تجھے فطرت کی اک محبوبۂ شیریں ادا کہتے

بہار آفرینش تھی شباب زندگانی تھی
جواں فطرت کا اک کھویا ہوا خواب جوانی تھی

تو جانِ عاشقی کانِ وفا شانِ حکومت تھی
تری سب سے بڑی تعریف یہ ہے ایک عورت تھی

زمانہ جانچتا رہتا ہے سچے آشناؤں کو
ہمیشہ یاد رکھیگا تری خالص وفاؤں کو

ہُوئی مر کر بھی خوابیدہ تو شوہر ہی کے پہلو میں
جگہ پائی جہانگیر ابن اکبر ہی کے پہلو میں

تیری ایجاد کو حاصل ہوئی ایسی جہانگیری
ہے ابتک عورتوں کے ہات میں تیری جہانگیری

چمن میں بلبلیں برسات میں جب گیت گاتی ہیں
جوانانِ چمن کو رس بھرے نغمے سُناتی ہیں

ہزاروں پھول کھل جاتے ہیں جس دم لالہ زاروں میں
جب آ جاتی ہے بارش سے روانی جوئباروں میں

سپہر نیلگوں پر جب ستارے جگمگاتے ہیں
کسان اپنے گھروں کو لوٹ کر کھیتوں سے آتے ہیں

سرِ شام اک خموشی ہوتی ہے طاری مکانوں میں
پرندے جا کے سو جاتے ہیں جس دم آشیانوں میں

سویرے جب ہزاروں ننھی چڑیاں چہچہاتی ہیں
ہوا کی چھیڑ پر مخمور کلیاں مسکراتی ہیں

غرض دنیا میں اک اک رسم جس دم رنگ لاتی ہے
زمینِ شہدرہ تیرے لئے آنسو بہاتی ہے

اختر شیرانی

کیفیات

نالۂ دل نارسا فریاد بے تاثیر ہے
یا الٰہی کیا محبّت کی یہی تقدیر ہے

جبہ سائی تیرے در کی سچ مگر کیا فائدہ
اب کہاں مٹتی ہے پیشانی میں جو تحریر ہے

رہروانِ جادۂ عمرِ رواں غافل نہ ہوں
ذرّہ ذرّہ خاک کا ہر لحظہ دامنگیر ہے

کیا شکایت راستے کی راہبر کا کیا قصور
اپنے حق میں خود ہی پائے ناتواں زنجیر ہے

بے زبانی کی مصیبت کس طرح آساں ہوئی
ہر نگاہِ یاس محسوسات کی تصویر ہے

جبہ سائی کے سوا کچھ کام ہی میرا نہیں
ساری پیشانی میں شاید اک یہی تحریر ہے

ہے نمایاں ہر طرف صنّاعیٔ قدرت کا رنگ
آنکھ ہو تو ذرّہ ذرّہ عالمِ تصویر ہے

میں نے مانا زادِ راہِ مرگ حسرت کچھ نہیں
یہ بھی کیا کم ہے کہ پہلو میں کسی کا تیر ہے

زندگی میری بجز رنجِ محبت کچھ نہیں
اس کو جس پہلو سے دیکھو ایک ہی تصویر ہے

دیکھ طے آسودگانِ خاک کس راحت میں ہیں
زندگی ہادی فقط اک دردِ دامنگیر ہے

ہادی

سوئے اتفاق

(گزشتہ سے پیوستہ)

آج سے دس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جب بہارِ عمر آرزوؤں کے شگوفوں اور تمناؤں کے پھلوں سے لبریز تھی۔ مجھے ابھی اپنی صنعت کے ابتدائی مدارج طے کرنے تھے۔ اور ذہن اس حالت میں تھا جب معمولی سے معمولی واقعہ کے تاثراتِ اولیں تقریباً تقریباً بقائے دوام کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ مجھے سپہر آرا سے عشق ہوا۔ پہروں کوٹھے پر کھڑا رہنا۔ چھپ چھپ کے بے معنی اور مبہم سے اشارے کرنا۔ کسقدر لغو معلوم ہوتا ہے لیکن اس عمر میں یہی چیزیں بہترین دلچسپی کا باعث تھیں۔ آخر کار یہ غیر شاعرانہ مدارج طے ہوگئے۔ اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ایک عورت سے جذبات انگیز ملاقات کی۔ پہلی دو تین ملاقاتوں کا تذکرہ جو میرے لئے سرمایہ مسرت تھا۔ شاید آپ کی سماعت کے لئے ناخوشگوار ہو۔ اس لئے اس حصے کو نظر انداز کرتا ہوں۔ اس کی شکل وصورت ـــ میں ابتک اس کا صحیح بیان نہیں کرسکتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اسے غیر معمولی فہم کی عورت سمجھتا تھا۔ یا شاید اس میں غیر از معمول بات واقعی موجود تھی۔ اس کے نقش سڈول نہ تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی خوش مزاجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لئے جاذب نظر تھے۔ اس کے چہرے میں سب سے دلچسپ اور محبوب چیز اس کے سرخ لب تھے۔ جو ہر وقت ہنسی سے متاثر نظر آتے تھے۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر باتوں کے جواب میں اپنے لبوں کو کچھ طنزیہ سے انداز میں متبسم بنا دیا کرتی۔ کبھی تو ایسا کرنا بے انتہا خوبصورت معلوم ہوتا کبھی اس کی وجہ سے میرے دل میں اپنی ذلت کا ایک بوجھ سا احساس پیدا ہو جاتا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اور پتلیوں کا رنگ بھورا تھا۔ وہ بھورا رنگ نہیں جو عام حالتوں میں کم و بیش ہر شخص کی پتلی میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ شوخ اور گہرا مجھے ان آنکھوں کی طرف دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ کبھی اس قسم کی کوشش کرتا، تو یوں معلوم ہوتا گویا کسی گہرے سمندر میں غرق ہوتا چلا جا رہا ہوں۔

ایک سال گزر گیا میں نے اس سے کہا مجھسے

شادی کر لو۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے مُسکرائی۔ اور میرے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیں۔ پھر مجھے پیار کرنے لگی۔ میں چپ ہو گیا۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے اُسے پھر کہا۔" مجھ سے شادی کر لو۔"

اُس نے اپنی بھوری آنکھیں دوسری طرف پھرا لیں۔ اور اس کی گھنی پلکوں کا سایہ اس کے تمتماتے ہُوئے رخساروں پر پڑنے لگا۔ پھر بولی۔" بھولے شاہزادے تم یہ توقع کیوں رکھتے ہو۔ کہ میں ساری عمر تم سے محبّت کروں گی۔ محبت ایک چنگاری ہے جو ہر شخص کے دل میں دبی ہُوئی رہتی ہے۔ بعض حالتوں میں یہ چنگاری سلگ اُٹھتی ہے۔ لیکن فوراً ہی بُجھ جاتی ہے۔ اسے زندگی کہا جاتا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ چنگاری شعلوں کی طرح لپکتی ہے۔ اور بجلی کی طرح چشم زدن کے لئے انسان کی ہستی کو منوّر کر جاتی ہے۔ اسے بھی زندگی کہا جاتا ہے۔"

میری معصومیت اس حقیقت کو برداشت نہ کر سکی۔ میں نے پُوچھا۔" تو کیا محبت ایک دو سال قائم رہتی ہے۔"

وہ ہنسی اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور اس انداز سے دیکھنے لگی۔ جس کا مقابلہ کرنا میرے امکان کی حدود سے باہر تھا لیکن آج اس کی دل آویزی کا طلسم ذرا سے عرصے کے لئے چکنا چور ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔" جاؤ۔ تم مجھے فریب دے رہی ہو۔ تم مجھ سے دغا کر رہی ہو۔"

وہ بے انتہا سنجیدہ ہو گئی۔ اور آہستہ سے کہنے لگی۔" فریب تک گوارا تھا۔ لیکن دغا نہیں۔ پھر ایسا لفظ کبھی استعمال نہ کرنا۔ دغا۔ یہی وہ لفظ جس میں قرونِ وسطیٰ کے تمام گناہوں کا نچوڑ جمع کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ پہلا واحد گناہ ہے جس کی آغوش میں باقی تمام گناہوں نے پرورش پائی ہے۔ یہی وہ زہر ہے جو انسان کے جسم کو نہیں بلکہ اس کے ذہن کو ملیا میٹ کرتا ہے۔"

میں حیران ہو گیا۔ مجھے قطعاً معلوم نہ تھا۔ کہ اس کا مطالعہ اس قدر وسیع ہے۔ آج وہ مجھے کچھ اجنبی سی معلوم ہوتی تھی۔

یکایک اس نے پہلو بدلا۔ اور اپنی آواز میں محبّت کی حرارت پیدا کر کے کہنے لگی۔" پیارے جتنی کوئی تم سے معمولی عورت سو سال میں محبّت کرتی میں نے ایک رات میں کی ہے۔ تم نہیں جانتے ہو کہ جن لوگوں کے ذہن کافی طور پر نشوونما پا چکتے ہیں، ان کی محبّت ایک جذبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک اضطراری کیفیّت ہوتی ہے۔ اس اضطراری کیفیت کے دوران میں وہ اپنی تمام شادابیوں اور نزہتوں کو محبوب کے قدموں

پر ڈال دیتے ہیں۔ وہ اس پر اپنی فردوس قلب کے تمام دروازے کھول دیتے ہیں۔ تاکہ محبت کی اس انتہائی شیرینی کو ایک دفعہ چھولے۔ جو ہمارے ہاتھوں میں آجاتی ہے۔ اور غائب ہو جاتی ہے۔ غائب ہو جاتی ہے اور آجاتی ہے۔"

مَیں نے کہا "تو کیا اس سے یہ مراد ہے کہ تمہاری محبت کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کب ختم ہو جائیگی۔ آہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دُنیا میں اس طرح کی عورتیں بھی موجود ہیں۔ تو مَیں شروع سے نسلِ انسانی کو حقارت سے دیکھتا۔"

اور میرے آنسو گرنے لگے۔

اس نے میرا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔ اور کہنے لگی۔ "پیارے مَیں تمہاری محبت کے لائق نہیں مرد ماں کی آغوش میں پلکر جوان ہوتا ہے۔ تو وہ مردانگی سیکھتا ہے۔ اسے شعریت اور تہذیب کی تکمیل تک پُہنچانے کے لئے ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں مَیں تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ لیکن کوشش کروں گی کہ جب تمہاری بیوی آئے، تو وہ تمہارے اکھڑ پنے کو زائل شدہ پائے۔"

اس دن مَیں اُٹھ کر چلا آیا۔ اور مَیں نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب مَیں اس سے نہ ملونگا لیکن اس کا خیال آتے ہی یہ ارادہ اس طرح کافور ہو جاتا۔ جس طرح سُورج کی شعاعوں کے سامنے شبنم اُڑ جاتی ہے۔ یاد رکھو کہ جب کسی عورت میں دو باتیں جمع ہو جائیں کہ اس کی طبیعت رسمیاتِ عہد سے گریز کرے۔ اور ساتھ ہی اپنے طریقِ زندگی میں جدّت پیدا کرے۔ تو یہ مجموعہ بے انتہا خطرناک ہوگا۔ رسمیات کی نفی اس قدر خطرناک نہیں جتنی جدت کے اثبات کے ساتھ مل کر ہو جاتی ہے۔

ایک رات جب چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی۔ اور شعاعِ ماہتاب کی لہریں اپنے ساتھ میرے دل میں جذبات کا ایک رقص پیدا کر رہی تھی۔ مَیں اس کے ہاں گیا۔ دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ اور میرے کانوں میں کسی مرد کی باتوں کی آواز آئی۔ جھانک کر دیکھا۔ ایک خوبرو جوان جس کا چہرہ غُصّے کے مارے سرخ ہو رہا تھا سپہر آرا کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک پستول تھی۔ سپہر کے لب خُشک تھے۔ اس کا چہرہ اس طرح سُکڑا ہُوا تھا۔ جس طرح کسی شخص کا چہرہ بیماری کے دوران میں نقاہت کی شدت سے سکڑ جاتا ہے۔ لیکن تم باور نہ کرو گے۔ وہ حقیقت میں ہنس رہی تھی۔

نوجوان نے خطرناک سکون سے کہا۔ "مَیں تمہیں کچھ نہ کہونگا۔ اس شخص کا نام بتاؤ۔ جس کے ساتھ

تم بھاگ کر آئیں۔ اُس شخص کا زندہ رہنا میری مردانگی کیلئے مستقل طعنہ ہے۔"

وہ چپ رہی۔

نوجوان نے پھر کہا۔ "سُنا! مجھے اس کا نام بتاؤ وہ کون تھا؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں پیشانی پر رگیں ابھر آئیں۔ اس نے پستول کو زمین پر پھینکدیا۔ اور سپھر کی طرف ہیبتناک سرعت سے بڑھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سپھر کا گلا پکڑ لیا اور اُسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہنے لگا۔ ہر چند کہ تم ایک عورت ہو اور میری بیوی ہو۔ یا شاید کبھی بیوی تھیں۔ کیونکہ اب میں تمہیں بیوی کے نام سے پکارنا۔ بیوی کے لفظ کے لئے انتہائی ننگ سمجھتا ہوں لیکن میں جھنجوڑ جھنجوڑ کر تمہارے اس پتھریلے سکون کو برباد کر دونگا۔ تمہارے لبوں پر سے اس دائمی مُسکراہٹ کے انداز کو نوچ لونگا۔ جن سے تم دلوں کو برباد کرتی ہو۔"

میں تصویر حیرت بنا سُن رہا تھا۔ گویائی اور توانائی دونوں مفقود تھیں۔ شاید اگر سپھر کوئی چیخ مارتی تو میں اس کی مدد کو کبھی نہ جاتا۔ کیونکہ میرے دل میں اس کے خلاف رشک بغاوت کا علم بلند کئے ہوئے کھڑا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ایک بیاہی ہوئی عورت تھی۔ جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اور پھر مجھے فریب دے رہی تھی۔ لیکن سپھر خاموش رہی۔ یہ خاموشی ناقابلِ برداشت تھی۔ کاش وہ کوئی آواز نکالتی۔ کاش وہ رحم کی التجا کرتی۔ لیکن نہیں۔ وہ چپ رہی۔ اور اس کے لب اس طرح ایک طنزیہ سے انداز میں بگڑی ہوئی مُسکراہٹ کا نقشہ پیش کرتے رہے۔ میں پھلانگ مار کر کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اور نوجوان کو شانوں سے پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنی پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کوٹ کے بٹن کھول دیئے۔ اور کہا۔ "نشانہ باندھو۔"

وہ میرے رویّہ کو دیکھ کر کچھ متعجب سا ہو گیا۔ فتح میری تھی۔

میں نے اپنے انتہائی توثیق کے لہجے میں کہا۔ "مجھے مارو۔ اور تم ایک بیگناہ کا خون اپنی گردن پر لو گے۔ میں تمہاری تمام باتیں سُنتا رہا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں وہ شخص نہیں جس کے ساتھ یہ بھاگ کر آئی ہے۔ میں اس کی فریب کاری کا ایک تازہ شکار ہوں۔ میرے سامنے اس نے اپنے آپ کو دوشیزہ ظاہر کیا۔ اور میں نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ میرے خیال میں اس عورت کے لئے ذرا سی جسمانی یا ذہنی

تکلیف برداشت کرنا انسانیت کے لئے باعث ننگ ہے۔ تم اسے بھول جاؤ۔ عین اس طرح جیسے کوئی شخص ایک پریشان خواب دیکھ کر بھول جاتا ہے۔ تم ایسے شخص کے ڈھونڈھنے کی کوشش نہ کرو۔ جو اسے بھگا کر لایا تھا۔ عورت کے لئے اور خاصکر ایسی عورت کے لئے جان کو خطرے میں ڈالنا حماقت کا آخری درجہ ہے۔"

نوجوان کے ہاتھ سے پستول گر پڑی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ نوجوان طیبر تھا

"اور تم یقین کرنا۔ کہ پھر اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ تالی بجا کر کہہ رہی تھی۔

"شاباش! شاباش میرے بقر شاباش۔"

ریاض خاموش ہو گیا۔ علامی طاہر نے تصویر کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگے۔ "سبحان اللہ ایسی ایسی عورتیں بھی دنیا میں ہوتی ہیں۔"

عابد

غزل

میں جدھر دیکھتا ہوں تو نظر آتا ہے مجھے
عرصۂ حشر بھی نیرنگ تماشا ہے مجھے

دل بگڑتا ہے مرا اور بھی ناصح چپ رہ
ہر نصیحت تیری تحریک جنوں زا ہے مجھے

کل جفا جو تجھے شاید کوئی موقعہ نہ ملے
آج ہی کیوں نہ ستا لے جو ستانا ہے مجھے

غیر کہتا ہے اگر مجھ کو برا کہنے دو
تم برا کہتے ہو اس بات کا شکوا ہے مجھے

وہ نہ گر آج بھی آئے تو یہ سمجھوں گا ضرور
وعدۂ شام بھی اک وعدۂ فردا ہے مجھے

قمر

وجدانیات

(۱)

جمال سحر کار اُس کا۔ شباب زرنگار اس کا بہار زندگانی ہے یہ جسم نوبہار اس کا
اسے معلوم ہے اپنی دل آرائی دل افروزی نگاہوں سے جھلکتا ہے غرور آشکار اس کا
شمیم حسن کا مخزن ہے زلفِ مشکبار اس کی معطر ہو گیا پیراہنِ گوہر نگار اس کا
بہار نزہت گلشن ہے اِک رنگیں مثال اس کی فروغ جلوۂ مہتاب ہے آئینہ دار اس کا
ابھی تک دل ہمارا کامرانِ شادمانی ہے ابھی ناآشنائے غم ہے عشق خامکار اس کا
وُہ آئیں یا نہ آئیں دل کو مایوسی نہیں ہوتی کمال مصلحت ہے یہ جنونِ انتظار اس کا

محبت عابدِ مجبور کی وقف کشاکش ہے
یہ خوے بیقرار اس کی یہ عشق خاکسار اس کا

---

(۲)

میرے دل پر داستانِ عاشقی تحریر ہے زندگی میری کتابِ حُسن کی تفسیر ہے
ایک مَیں ہوں اور بیتابی کی لاکھوں صورتیں شومیِ تقدیر ہے محرومی تدبیر ہے

آپ مل کر کیا گئیں آرام دل کا کھو گیا
کیا یہی خواب سکونِ قلب کی تعبیر ہے

عابد

لمعات

بہارِ غم بہارِ جاوداں معلوم ہوتی ہے
بس اک ناسورِ چشمِ خونچکاں معلوم ہوتی ہے

جبیں کا داغ اب روشن نہیں ہوتا نہیں ہوتا
جبیں اب ہم کو ننگِ آستاں معلوم ہوتی ہے

ہر اک نقشِ قدم میں ایک جنّت ہے نگاہوں کی
تری رفتار موجِ گلفشاں معلوم ہوتی ہے

نہ وہ آتے ہیں فرقت میں نہ موت آتی ہے فرقت میں
مری ہر ایک محنت رائیگاں معلوم ہوتی ہے

خُدا چاہے تو حاصل ہو مجھے بھی وصل کی دولت
وہ دولت جو نصیبِ دُشمناں معلوم ہوتی ہے

مری رگ رگ میں لطفِ زندگی کی موجِ رقصاں ہے
طبیعت بادۂ غم سے جواں معلوم ہوتی ہے

مصیبت لاکھ ہو میرا قدم رہ سے نہیں ہٹتا
محبّت بے نیازِ این و آں معلوم ہوتی ہے

شرابِ حُسن پینے سے نہیں تھکتی نہیں تھکتی
نظر میری حریصِ گلرخاں معلوم ہوتی ہے

ہر اک شے میں تڑپ ہے کاوشِ دردِ محبت کی
ہر اک شے عاشقی کی رازداں معلوم ہوتی ہے

چلی آتی ہیں موجیں لطفِ مضموں کی مرے دل میں
طبیعت ایک بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے

کہاں سے آئیں یہ رنگینیاں اشعارِ اکبر میں
ہمیں عابدؔ کی یہ طرزِ بیاں معلوم ہوتی ہے

اکبر

؎ استاذی حضرتِ عابدؔ

میری داستان حیات

(مسلسل)

بیسواں باب

کالج کی تعلیم اور اس کے طریقے

کالج میں داخل ہونے کی جدّوجہد کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اب میں ریڈکلف میں جس وقت چاہتی داخل ہو سکتی تھی لیکن کالج میں داخل ہونے سے قبل یہ مناسب سمجھا گیا۔ کہ مَیں مسٹر کیتھ سے ایک سال اور تعلیم حاصل کروں۔ پس سنہ ۱۹۰۰ء کے اختتام سے پہلے میرا کالج میں داخل ہونے کا خواب، اصلیت کی شکل اختیار نہ کر سکا۔ مجھے ریڈکلف میں داخلے کا پہلا دن یاد ہے۔ میرے لئے یہ دن دلچسپیوں سے لبریز تھا۔ کئی سالوں سے مَیں اسی دن کی متوقع رہی تھی مجھے ایک زبردست قوت نے جو میرے احباب کی ترغیب اور میرے دلی اصرار سے زیادہ مضبوط تھی۔ یہ تحریک کی تھی۔ کہ مَیں اپنی طاقت کا مقابلہ ان لوگوں کے معیاروں کے مطابق کروں۔ جو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ مَیں جانتی تھی۔ کہ میرے راستے میں مشکلات حائل ہیں۔ لیکن مَیں انہیں مغلوب کر لینے کی خواہشمند تھی۔ مَیں نے اس دانا رومی کے الفاظ دل پر نقش کر لئے تھے۔ جس نے یہ کہا تھا۔ کہ روما سے شہر بدر کئے جانے کے تو فقط یہی معنی ہیں کہ اندرونِ روما کی بجائے اس سے باہر زندگی بسر کروں۔" علم کی شاہراہ سے بدر ہو کر مجھے فقط اتنا ہی خسارہ تھا۔ کہ مَیں اپنا علمی سفر ایسے دیہاتی راستوں سے اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ جن پر کثرت کے ساتھ آمد و رفت نہ ہو۔ مَیں جانتی تھی کہ کالج میں بہت سے علم کے ایسے چور راستے موجود ہیں۔ جہاں مَیں ان لڑکیوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر سکتی تھی۔ جو میری طرح تخیل، موانست اور علمی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ مَیں نے خدا کا نام لے کر اپنے مطالعہ کو اشتیاق کے ساتھ جاری کیا۔ ایک نئی دُنیا اپنی شانِ رعنائی اور اپنے علمی کو ساتھ لئے ہُوئے مجھ پر منکشف ہو رہی تھی۔ اور مَیں نے تمام اشیاء کو معلوم کرنے کی قابلیّت کو اپنے ہاں موجود پایا۔ نفس کے عجائب خانے میں کسی اور ذی رُوح کی مانند مجھے بھی آزادی

اور مساوات حاصل تھی۔ اس کے اندر جو جو نظارے
اطوار اور شادی غمی کی کیفیات موجود ہیں۔ اور جنہیں اصلی دُنیا
کا زندہ اور صحیح ترجمان ہونا چاہئے۔ وہی کیفیات مجھے بھی
محسوس ہوتی تھیں۔ لیکچروں کے ہال کمروں میں حکما اور مشاہیر
کی رُوح پائی جاتی تھی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر
حکمت کے زندہ مجسمے ہیں۔ اس وقت کے بعد اب تک اگر
اس کے خلاف میرے خیالات میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے
تو میں اسے کسی پر آشکار نہیں کروں گی۔ مجھے جلد ہی یہ معلوم
ہونے لگا۔ کہ کالج دراصل وہ پُر افسانہ درسگاہ نہیں، جو
میرے تخیل میں تھی۔ میرے بہت سے خواب، جو میری
ناتجربہ کاری کے باعث دماغ میں گھوم رہے تھے۔ اپنی
شانِ دلآویزی کھوکر روزِ روشن میں بے حقیقت ہو چکے
تھے۔ میں نے رفتہ رفتہ یہ معلوم کرنا شروع کیا کہ کالج کے
داخلے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ ایک دقّت جو مجھے
اس وقت سے ابتک محسوس ہو رہی ہے وقت کی قلّت
تھی۔ اس سے پیشتر میں اپنے دل کے ساتھ غور و فکر میں مصروف
رہتی تھی۔ میں کسی شام کو بیٹھ کر اپنی رُوح کے اندرونی نغموں میں
مگن رہا کرتی تھی۔ یہ کیفیت اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے
جبکہ کسی کے پاس فراغت کی گھڑیاں ہوں۔ اور اس حالت میں
کسی مرغوب شاعر کا کلام ان روحانی تاروں کو چھیڑ کر وجد میں
لائے۔ جو اس سے قبل خاموش پڑی رہی ہوں۔ لیکن کالج میں
اپنے خیالات کے ساتھ ہمکلام ہونے کی فرصت کہاں؟
وہاں بظاہر انسان تحصیل علم کے لئے جاتا ہے نہ کہ تخیل میں
غوطے کھانے کے لئے جب کوئی شخص ان علمی دروازوں میں
داخل ہوتا ہے تو اسے اپنی عزیز ترین مسرتوں یعنی اپنے تخیل
اور تفریح کی کتب کو باہر ہی باہر سرسراتے ہوئے درختوں
کے پاس الوداع کہہ کر آنا پڑتا ہے۔ مجھے اس خیال سے
یہ معلوم کر کے تسلی حاصل ہونی چاہئے تھی کہ میں آئندہ کی
تفریح کے لئے علم کا ذخیرہ جمع کر رہی ہوں لیکن چونکہ میں
ناعاقبت اندیش تھی۔ اس لئے میں اپنی موجودہ خیالی خوشیوں
کو دولتِ علم کے اُس خزانے پر ترجیح دے رہی تھی جو کسی
ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔ کالج کے پہلے سال میں
میرے مضامین فرانسیسی، جرمن، تواریخ، انگریزی مضمون نویسی
اور ادبیات تھے۔ میں نے فرانسیسی میں کارنیلی، مولیئر، ریسن،
الفریڈ ڈی موسیٹ، اور سینٹ بیو کی بعض تصانیف کو
عبور کیا۔ اور جرمن میں گوئٹھے اور شلر کی تصانیف کو پڑھا
میں نے سرعت کے ساتھ سلطنت رومۃ الکبریٰ کے زوال
سے لیکر اٹھارھویں صدی کی تاریخ تک تمام حصّے کا مطالعہ
کر ڈالا۔ انگریزی علم ادب میں ملٹن کی نظموں اور اس کی تصنیف
"ایریوپیگٹیکا" کا تنقیدی پہلو سے مطالعہ کیا۔ بسا اوقات
مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ میں نے کالج میں ان حیرت انگیز
کام کی دقّتوں کو کس طرح مغلوب کیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ

جماعت کے کمرے میں مجھے عملی طور پر تنہائی میں ہی بیٹھنا پڑتا تھا۔
پروفیسر تقریر کرتے وقت مجھ سے اس قدر دور ہوتا تھا۔ گویا
وہ ٹیلیفون کے ذریعہ باتیں کر رہا ہے۔ اس کے لیکچر میرے
ہاتھ پر جتنی سرعت کے ساتھ ممکن ہوتا تھا' دستی ہجا کے ذریعے
ظاہر کئے جاتے تھے۔ اس طریق سے جماعت کے ساتھ چلنے
کی دوڑ میں پروفیسر کی شخصیت کا بیشتر حصہ مجھ سے اوجھل ہو جاتا
تھا۔ الفاظ میرے ہاتھ پر ان شکاری کتوں کی سی تیزی کے
ساتھ دوڑ لگاتے تھے۔ جو کسی خرگوش کا تعاقب کر رہے ہوں
اور جسے وہ اکثر پکڑ نہیں سکتے۔ لیکن اس لحاظ سے میں ان
لڑکیوں کے مقابلے میں چنداں پیچھے نہیں رہتی تھی۔ جو لیکچر
سنکر اس کے اشارات قلمبند کرتی تھیں۔ میرا مدعا یہ ہے۔ کہ
اگر انسانی نفس الفاظ کو سننے اور انہیں مشین کی طرح اندھا دھند
کاغذ پر لکھنے کے کام میں مشغول ہو تو میرا خیال ہے۔ کہ وہ
زیر بحث مضمون یا ادائیگی مطلب کی طرف چنداں متوجہ نہیں
ہو سکتا۔ میں لیکچر کے دوران میں اس کے نوٹ کیسے قلمبند
کر سکتی تھی۔ جبکہ میرے ہاتھ گویا اسے سننے میں مشغول تھے۔
بالعموم میں بعد میں گھر جا کر لیکچر کا جس قدر حصہ یاد آتا تھا لکھ بھی
لیتی تھی۔ روزمرہ کے مضامین، مشقیں، تنقید اور امتحانی پرچوں
ششماہی اور سالانہ امتحانات کے جوابات کو اپنے ٹائپ رائٹر
پر چھاپ لیتی تھی۔ جس سے پروفیسروں کو میری قابلیت معلوم
کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ جب میں نے لاطینی
علم عروض کا مطالعہ شروع کیا۔ تو میں نے بحر کی علامات کا ایک
طریق ایجاد کر کے اپنے پروفیسر کو سمجھایا۔ جس سے شعر کے مختلف
بحر اور اوزان مجھ پر ظاہر ہو سکتے تھے۔ میں نے ٹائپ کی مختلف
مشینیں آزمانے کے بعد ہمینڈ کی مشین کو اپنے کام کی خاص
ضروریات کے مطابق نہایت موزوں پایا ہے۔ اور میں نے
اسی کا استعمال اب تک جاری رکھا ہے۔ اس مشین کے
ذریعے حروف منقولہ کی پھرکیوں کا استعمال ہو سکتا ہے۔
اور بیک وقت مختلف پھرکیوں کے ذریعے سے مختلف
حروف کے مجموعوں، مثلاً یونانی، فرانسیسی یا ریاضی کی علامات
لگا کر بموجب ضروریات تحریر اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔
اس مشین کے بغیر میں کالج میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ مختلف
مضامین کی مطلوبہ کتب میں بہت کم ایسی ہیں جو اندھوں کے
لئے طبع ہوئی ہیں۔ اسی لئے میں مجبوراً ان کے مفہوم کی خاطر
اپنے ہاتھ پر ان کا ہجا کرانے کی محتاج تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
مجھے دوسری لڑکیوں کی نسبت اپنے اسباق کی تیاری کے لئے
زیادہ وقت درکار ہوتا تھا۔ اس میں دستی ہجا اور تحریر کا حصہ
مقابلتہً زیادہ طولانی ہے۔ اور مجھے اس باب میں بعض ایسی
پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن سے دوسری لڑکیاں
محفوظ تھیں۔ بعض دن ایسے بھی آتے تھے کہ تفصیلات پر
پوری پوری مطلوبہ توجہ صرف کرنے سے میرا مزاج برہم ہو جاتا
تھا۔ چنانچہ میں اس خیال سے آمادہ جنگ ہو جاتی تھی کہ مجھے

تو چند ابواب کے پڑھنے پر گھنٹوں صرف کرنے ہونگے۔ جب کہ
اسی اثنا میں باہر دوسری لڑکیاں اچھل کود، نغمہ سرائی اور
ہنسی کھیل میں مصروف ہیں۔ لیکن اس کے بعد معاً میں اپنی زندہ دلی
کو بحال کرکے اس ناشکری کے تصوّر کو دل سے نکال ڈالتی تھی
بہرحال جس کسی کو صحیح علم حاصل کرنا ہے اسے مشکلات کی
کٹھن پہاڑی پر تن تنہا سفر کرنا ہوگا۔ اور چونکہ اس علمی چوٹی
پر پہنچنے کی کوئی شاہراہ تو ہے نہیں، لہٰذا مجھے بالخصوص
وہاں تک پہنچنے کے لئے اپنی ہی کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی راہ
نکالنی پڑتی تھی۔ میں اس سفر میں بسا اوقات پیچھے پھسل پڑتی
تھی، کبھی گر پڑتی اور کبھی کھڑی ہو جاتی تھی۔ پھر بھی کبھی کسی
سدِّ راہ کے ساتھ ٹکر کھا کر بدمزاج ہو جاتی۔ لیکن جلد ہی
سنبھل کر صحیح الخیال ہو جاتی تھی۔ میں کوشش کرکے چلنے
لگتی۔ پھر ترقی کرنے لگتی جس سے مجھے کچھ حوصلہ ہو جاتا۔ میں
اور زیادہ مشتاق ہو کر بلندی پر چڑھ جاتی۔ اور مجھے علم کا وسیع
افق نظر آنے لگتا تھا۔ ہر کشمکش کو ایک فتح تصوّر کرنا چاہیے
چنانچہ ایک اور کوشش سے میں چمکدار بادل کی بلندی پر
چڑھ گئی۔ اور آسمانِ علم کی نیلگوں گہرائی سے گزر کر اپنی خواہش
کی بلند فضا پر پہنچ گئی۔ اس تمام کشمکش میں میں پھر بھی تنہا سفر
نہیں کر رہی تھی۔ مسٹر ولیم ویڈ اور مسٹر ای ایلن پرنسپل پنسلونیا
نابینا مدرسہ نے میرے لئے بہت سی ابھرے ہوئے
حروف کی کتب بہم پہنچائیں۔ ان کی خبرگیری میرے حق میں
اسقدر امداد اور حوصلہ افزائی کا موجب رہی۔ کہ خود انہیں اس
کا علم مجھ سے زیادہ نہیں ہوا۔ ریڈ کلف میں دوسرے سال
کے قیام میں میں نے انگریزی مضمون نگاری انجیل بحیثیت
انگریزی ادب امریکہ اور یورپ کا نظامِ حکومت ہوریس کا
منظوم کلام اور لاطینی کامیڈی[لہ] کا مطالعہ کیا۔ مضمون نویسی
کی جماعت سب سے پُر لطف تھی۔ اس کے لیکچر ہمیشہ دلچسپ
مسرت افزا اور ظریفانہ ہوتے تھے۔ کیونکہ اس شعبہ کے لیکچرار
مسٹر چارلس ٹاؤنشینڈ کوپلینڈ تمام ان لیکچراروں کے مقابلے
میں جن سے میں مستفید ہوئی۔ علم ادب کو اپنی جدّتِ طبع
اور پوری قوت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ گھنٹہ بھر کے لیکچر
میں ہمیں تمام ماہرینِ ادب کے خیالات کے بہترین نچوڑ سے
جو ایک دائمی رعنائی کو اپنے ساتھ لئے ہوتے تھا کسی قسم کی
فضول تشریح اور توضیح کے بغیر سرشار ہونے کا موقع ملتا
تھا۔ جس سے ان نفیس خیالات کا سرور طبیعت پر چھا جاتا
تھا۔ انجیل کے پرانے عہد نامے کی سُریلی گرج کے لطف
میں تمام روح شریک ہوتی تھی۔ اس کے بعد انسان ایک
ایسے مسرت آمیز احساس کے ساتھ گھر جاتا ہے کہ اسے اس
تکمیل کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس میں جسم اور روح
ایک غیرفانی خوش آہنگی اور موافقت کے ساتھ ابدی زندگی

لہ کامیڈی اس ناٹک کو کہتے ہیں جسکا انجام شادمانی ہو۔ (مترجم)

گزار رہے ہوں۔ نہال زمانہ کی قدیمی شاخ پر حقیقت اور حُسن کا پھول ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتا ہے۔

یہ سال زندگی کا سب سے زیادہ مسرت افروز زمانہ تھا۔ کیونکہ مَیں نے وہ مضامین پڑھے جن میں مجھے خاص دلچسپی تھی یعنی اقتصادیات۔ ملکہ الزبیتھ کے عہد کا علم ادب شیکسپیئر (زیر نگرانی پروفیسر جارج کٹریج صاحب) اور تاریخ فلسفہ، جسے پروفیسر جوزایا رائیس پڑھاتے تھے۔ فلسفہ کے مطالعہ سے ہمیں عہد قدیم کی روایات اور دوسری اقسام خیال سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ جو اس کے بغیر ہمیں اجنبی اور نامعقول دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میری توقع کے خلاف کالج ایسی جگہ ثابت نہیں ہوتی۔ جسے حکمائے یونان کا ایک ہمہ گیر مرکز کہا جا سکے۔ کالج میں ہمیں مشاہیر عالم سے ملاقات نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہم ان کی زندہ موجودگی کا احساس کر سکتے ہیں۔ گو ان کا وجود وہاں چھایا ہوتا ہے لیکن دراصل وہ مومیائی مصری کی طرح ہے۔ ہمیں علم کی شگاف دار دیواروں سے ان کو باہر نکال کر ان کی تجزی تحلیل اور چیر پھاڑ کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے روبرو ایک حقیقی ملٹن یا یسعیاہ نبی کھڑا ہے۔ اور وہ محض ایک ہوشیاری اور چالاکی سے بنائی ہوئی نقل نہیں ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سے عالم اس حقیقت کو فراموش کئے دیتے ہیں۔ کہ علم ادب

کی بڑی بڑی تصانیف سے ہمارا مسرور ہونا اس امر پر موقوف نہیں کہ ہم ان کا پورا پورا ادراک کر سکیں۔ بلکہ وہ ہماری ہمدردی کی گہرائی پر منحصر ہے۔ وقت یہ ہے کہ ان تصانیف کی محنت سے انجام دی ہوئی تشریح کا بہت کم حصّہ ذہن میں باقی رہتا ہے۔ نفس ان حصّوں کا تحفظ اُسی طرح چھوڑ دیتا ہے جیسے کوئی ثمردار شاخ اپنے حد سے زیادہ پختہ میوے کو نیچے گرا دے یا ہمارے لئے کسی پھول کو مع اس کی جڑ، ٹہنی دوسرے حصوں اور اس کے نمو کے تمام عمل کے معلوم کر لینا آسان ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ ممکن ہے کہ ہمیں اس پھول کے حسن کا کوئی اندازہ نہ ہو۔ جب کہ آسمان کے تلے شبنم نے اسے ابھی ابھی غسل کرایا ہو۔ مَیں نے بار بار بے صبری کے ساتھ دل سے یہ سوال کیا ہے۔ کہ "مَیں کیوں فضول تشریحات ادب میں اُلجھتی رہوں؟" یہ تشریحات میرے فضلائے خیال میں ادھر سے اُدھر اس طرح چکّر لگاتی ہیں۔ جیسے اندھے پرندے ہوا میں اپنے بے اثر بازوؤں کے ساتھ پر مارتے ہوں۔ میرا اس سے یہ مُدّعا نہیں کہ مَیں اپنی زیر مطالعہ مشہور تصانیف کے مکمل ادراک اور علم حاصل کرنے پر اعتراض کر رہی ہوں۔ مَیں فقط اُس لامتناہی تشریح اور عقل حیران کر دینے والی تنقید پر معترض ہو رہی ہوں۔ جو فقط ایک ہی سبق سکھاتی ہے یعنی یہ کہ "جتنے مُنہ اتنی باتیں"۔ البتہ جب پروفیسر کٹریج

جیسا علامہ شیکسپیئر کے کلام کی تشریح کرے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا اندھے کو دو آنکھیں مل گئیں۔ پروفیسر ممدوح دراصل شیکسپیئر کو آنکھوں کے سامنے لاکر زندہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ میں چاہتی ہوں کہ جن باتوں کے جاننے کی مجھ سے توقع کی جاتی ہے ان میں سے نصف کو برطرف کر دوں۔ کیونکہ تھکا ماندہ دماغ اس علمی خزانے کا لطف نہیں اُٹھا سکتا، جس کے حاصل کرنے میں اسے حد سے زیادہ محنت صرف کرنی پڑے۔ میرا خیال ہے کہ ایک ہی دن میں چار یا پانچ مختلف کتابیں پڑھ لینا دشوار ہے، جو مختلف زبانوں اور مختلف مضامین کے متعلق ہوں۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی وہ مقصد بھی نظر سے اوجھل نہ ہو۔ جس کے لئے ہم مطالعہ کر رہے ہوں۔ جب کوئی شخص تحریری امتحان کا تصور دل میں لئے ہوئے سرعت اور گھبراہٹ کے ساتھ مطالعہ کرے تو اس کا دماغ نادر خیالات کے ایک ایسے ذخیرے سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جس کا چنداں فایدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس وقت میرے دماغ کی بھی یہی کیفیت تھی کہ اس میں مختلف خیالات کا ایک انبار تھا۔ جسے ترتیب دینے کی کوشش کرتے وقت مجھے تقریباً ناکامی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ جب میں اُس خطۂ قلب میں داخل ہوتی تھی۔ جہاں میرے نفس کا تعلیمی جزو حکمرانی کرتا ہے۔ تو مجھے ایسا معلوم

ہوتا تھا جیسے شیش محل میں کُتا گھس آیا۔ ہزاروں متفرقات علم میرے دماغ میں اس طرح آنے شروع ہوتے تھے۔ جیسے آسمان سے اولے گریں۔ جب میں ان سے بچنے کی کوشش کرتی تو مضامین کے بھوت اور طرح طرح کے کالجی عفریت میرا پیچھا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دق ہو کر میرا جی چاہتا تھا۔ (اگرچہ یہ خواہش قابلِ معافی ہے) کہ میں ان تمام علمی بتوں کو جن کی پرستش کرتی رہی ہوں۔ زمین پر دے ماروں اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ میری کالجی زندگی میں امتحانات کا ہوّا سب سے زیادہ ڈراؤنا تھا۔ اگرچہ میں کئی مرتبہ اُس سے دوچار ہوئی۔ اور میں نے اسے زمین پر بتیری پٹخنیاں دیں۔ لیکن پھر بھی وہ بھوت اُٹھ کھڑا ہوتا اور مجھے اپنی زرد رو ہیبت سے دھمکیاں دیتا تھا۔ حتیٰ کہ بوب ایکرز[۱] کی مانند میری بہادری میری انگلیوں کے سروں پر سے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگتی تھی۔" کڑی آزمائش کے ان ایام کی ابتدا سے پیشتر کئی کئی دن تک دماغ میں مضامین کے مخفی اور متعلق قواعد اور ناقابلِ ضبط تواریخ کا مواد ٹھونسنا پڑتا تھا۔ یہ سب ایک بدذائقہ طعام ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی

[۱] انگریزی ڈراما نویس شیریڈن کے ایک ناٹک میں ایک ڈرپوک، مغرور، لڑاکے اور مسخرے کیریکٹر کا نام ہے۔ عبارت بین الواوین اسی کیریکٹر کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ (مترجم)

بھر بار کرتے کرتے میرا جی چاہتا تھا کہ میں کتب اور سائنس سمیت سمندر کی گہرائی میں ڈوب مروں۔ بالآخر جس وقت کا دھڑکا ہوتا ہے وہ آن پہنچتا ہے۔ اگر تم نے اس کی تیاری کی ہو تو تم ایک خوش قسمت انسان ہو کہ اپنے ان خیالات کو اپنی مدد کے لئے بروقت نکالکر اس عظیم کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تم ان خیالات کو اپنے پاس بلانے کی غرض سے اپنا بگل بجاتے ہو۔ مگر اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ تب انسان نہایت حیران ہو کر غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہے۔ کہ عین اسوقت جبکہ ہمیں اپنے حافظے اور قوتِ امتیاز کی مدد درکار ہوتی ہے یہ فُوار پر لگا کر اُڑ جاتی ہے۔ جن امور کے تحفظ میں تم نے بے انتہا محنت صرف کی ہو، وہ عموماً عین اس آڑے وقت میں جواب دے جاتے ہیں۔ اور پاس نہیں پھٹکتے۔

مثلاً سوال کیا جاتا ہے کہ "ہس اور اس کے کارناموں کا مختصر حال لکھو۔" ہم سوچتے ہیں کہ "یہ کون شخص تھا۔ اور اس کے کارنامے کیا تھے؟ تعجب ہے کہ نام تو آشنا معلوم ہوتا ہے۔" ہم تاریخی امور کے میدانیہ میں ادھر اُدھر بہتیرا نظر دوڑاتے ہیں۔ جس طرح درزی کسی تھیلے میں ریشم کی کوئی کترن تلاش کرتا ہے۔ اور وہ اسے نہیں ملتی۔ وہی حالت ہماری ہوتی ہے۔ ہمیں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ شخصیت، جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے، ابھی اگلے روز ہی ہماری نظر سے گزری تھی۔ جبکہ ہم تاریخ کے حصۂ "اصلاح" کا مطالعہ کر رہے تھے۔ لیکن اب وہ کہاں غائب ہے؟ ہم علمِ تاریخ کے متفرق حصوں پر نظر دوڑاتے ہیں یعنی انقلاب، قتلِ عام، طریقِ حکومت وغیرہ لیکن ہس کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم ان تمام امور کو جو امتحانی پرچے میں درج نہیں، جانتے ہیں۔ اور اس سے ہمیں تعجب بھی ہوتا ہے لیکن اس بے حقیقت سی بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ بالآخر دق ہو کر ہم اپنے ذخیرۂ علم کو دوسہارتے ہیں۔ اور تمام چیزیں باہر نکل آتی ہیں۔ لیجئے آپ کے ہس صاحب ایک کونے میں متانت کے ساتھ کھڑے کچھ سوچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور انہیں اس کا کچھ بھی علم نہیں کہ ہم پر وہ کہاں سے اتنی مصیبت لے آئے تھے۔ عین اسوقت امتحان کے نگران صاحب پکار اُٹھتے ہیں کہ "وقت ہو چکا" ہم ایک نہایت شدید بدمزگی کے ساتھ اس تمام علمی ردی کو جو ہمارے ذہن میں جمع تھی ایک کونے میں ٹھکرا کر گھر چلے آتے ہیں۔ اور ہمارے دماغ میں ممتحن کے اس خدائی اختیار کے خلاف، انقلاب آمیز خیالات کی ایک گشت شروع ہو جاتی ہے۔ جو اسے امتحان دہندہ کی مرضی کے بغیر سوالات پوچھنے کے لئے حاصل ہے۔

اس باب کے آخری ایک دو صفحات میں بعض استغاروں سے میں نے اس قسم کے استعمال کئے ہیں جن کو پڑھ کر

ناظرین میری ہنسی اُڑائیں گے۔ اب بھی یہ استعارے
میرے روبرو اکڑ اکڑ کر چلتے اور مجھ پر تمسخر کر رہے ہیں
اور اس شیش محل کے گنبد پر اولے برس رہے ہیں
ڈراؤنے ہوئے اس پر زرد رو ہو کر ٹکٹکی لگا رہے
ہیں۔ ان استعاروں کی تحلیل کہاں تک کیجائے۔ انہیں
مجھ پر ہنسنے دیجئے۔ ان الفاظ کا استعمال تو میرے
لڑکھڑانے والے خیالات کی فضا کو جس میں میری زندگی
بسر ہوتی رہی ہے ایسی خوبی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے
کہ اب میں ایسے الفاظ کو آخری مرتبہ دیکھ کر ان کا دفتر
تہ کئے دیتی، میں اور متانت کو اپنا شعار کر کے، یہ
کہے دیتی ہوں، کہ اب میرے کالج خیالات تبدیل
ہو چکے ہیں۔ یہ تذکرہ محض اس فضا کے بموجب تھا، جو
کالج کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ میں ابھی ریڈ کلف میں
اپنے مستقبل کا انتظار کر رہی تھی، کہ ان ایام کے
اردگرد افسانیت کا ایک روشن حلقہ چھا گیا تھا، جو
اب مدھم پڑ چکا ہے۔ لیکن افسانہ پن سے ہٹ کر
اصلی دُنیا میں قدم رکھتے وقت جو انقلاب کا زمانہ آیا۔
اس میں مجھے بہت سی چیزوں کا علم حاصل ہوا۔ اگر
میں اس تجربہ کی آزمائش نہ کرتی، تو یہ واقفیت مجھے
ہرگز حاصل نہ ہوتی۔ ان اشیاء میں سے ایک تو صبر و تحمل کی
قیمتی سائنس ہے۔ جو یہ ہے کہ ہمیں اپنی تعلیم اس طرح حاصل
کرنی چاہئے جیسے ہم کسی ملک میں سیر کر رہے ہوں۔ ہمارے
دلوں کو ہر قسم کے اثرات قبول کرنے کے لئے کشادہ رہنا
چاہئے۔ ایسا علم، غائب رُوح کو گہرے خیالات کے
بے آواز مدوجزر کے ساتھ بھرپور کر دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ "علم ایک طاقت ہے"، "نہیں، بلکہ میں کہونگی کہ علم تو ایک
سامانِ راحت ہے۔ کیونکہ وسیع اور گہرے علم کے ذریعے
اصلی مقاصدِ زیست، باطل مقاصد سے اور بلند اشیاء،
پست چیزوں سے الگ الگ تمیز کی جاتی ہیں۔ اُن خیالات
اور کارناموں کو معلوم کرنا جو انسانی ترقی کو متاثر کرنے
والے ہیں۔ دراصل انسانیت کے قلبِ واحد کی اس آواز
کو سننا ہے۔ جو صدیوں سے دھڑکتا چلا آتا ہے۔ اور اگر
کوئی شخص ان تمام حرکات میں آسمان کی طرف بلند ہونے
کی کوشش کا اثر نہیں پاتا تو وہ زندگی کی ہم آہنگ صداؤں
کی طرف سے بہرا ہے۔

اکیسواں باب

کتابی تعلیم کی ابتدا اور انتہا

میں نے اس وقت تک اپنی زندگی کے واقعات
ایک کا خاکہ سا کھینچا ہے۔ لیکن میں نے یہ نہیں بتایا کہ
نہ فقط مسرت اور دانائی کی خاطر بلکہ اُس تمام علم کی خاطر

جو دوسرے لوگوں کو اپنی آنکھوں اور کانوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ مَیں کہاں تک کتابوں کی محتاج رہی ہوں درحقیقت میری تعلیم میں کتب کی وقعت، دوسروں کی تعلیم کے مقابلے میں اس قدر زیادہ رہی ہے کہ اس کا بیان مَیں اس وقت سے شروع کرتی ہوں۔ جب سے میں نے پڑھنے کی ابتدا کی، مَیں نے اپنی سب سے پہلی مسلسل کہانی مئی ۱۸۸۷ء میں پڑھی تھی۔ جبکہ میری عمر سات برس کی تھی۔ اور اس دن سے آج تک، جو واقفیت مطبوعہ شکل میں میری تشنۂ علم انگلیوں کے سروں تک پہنچی، اسے مَیں نے جذب کرلیا۔ جیسا کہ مَیں نے بیان کیا ہے۔ میری تعلیم کے ابتدائی سالوں میں، میرا مطالعہ باقاعدہ نہیں رہا تھا۔ اور نہ مَیں نے کسی ضابطے کی پابندی کے بموجب پڑھا تھا۔

پہلے پہل میرے پاس صرف چند اُبھرے حروف کی کتابیں تھیں یعنی مبتدیوں کی "ریڈریں"، بچوں کے لئے چند کہانیوں کا مجموعہ اور زمین کے متعلق ایک کتاب "ہماری دُنیا" تھی، یہی میرا تمام ذخیرہ تھا لیکن میں نے ان کو بار بار پڑھا حتّیٰ کہ الفاظ اُنگلیوں سے دب کر اتنے پُرانے ہو گئے۔ کہ وہ پڑھے نہیں جاسکتے تھے بعض اوقات مس سلیون صاحبہ مجھے پڑھ کر سُنایا کرتی تھیں یعنی میرے ہاتھ پر چھوٹی چھوٹی کہانیوں اور نظموں کا ہجا کر دیتی تھیں۔ جنہیں مَیں سمجھ سکتی تھی۔ لیکن مَیں اس طریق کی بجائے از خود پڑھنے کو ترجیح دیتی تھی۔ کیونکہ جن چیزوں سے مَیں لطف اُٹھاتی تھی۔ انہیں بار بار پڑھنا پسند کرتی تھی۔ بوسٹن کی سیر کے دوران میں مجھے یہ اجازت تھی کہ دن کا کچھ حصّہ انسٹی ٹیوشن کے کتب خانہ میں صرف کروں اور ایک الماری سے دوسری الماری تک گشت لگا کر جو کچھ میری اُنگلیوں کے تحت میں آئے اُسے ضبط کرلوں۔ خواہ مَیں ایک صفحے پر دس لفظوں میں سے ایک یا دو لفظ ہی سمجھ سکوں۔ تاہم مَیں پڑھتی ضرور تھی۔ الفاظ کا وجود ہی میرے لئے نادر تھا۔ لیکن مَیں جو کچھ پڑھتی تھی اس کا کوئی اندازہ ہوشمندی کیساتھ نہیں کرتی تھی۔ تاہم اس زمانے میں میرا ذہن بہت ہی اثر پذیر ہوگا۔ کیونکہ بہت سے الفاظ اور جملے کے جملے مجھے حفظ یاد ہو جاتے تھے — جن کے معانی کا مجھ کو ذرا سا بھی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ بعد ازاں جبکہ مَیں بولنے اور لکھنے لگی۔ اس وقت یہی الفاظ اور جملے بالکل قدرتی طور پر دورانِ گفتگو میں نکل پڑتے تھے۔ اور اس سے میرے احباب میرے ذخیرۂ الفاظ کی کثرت پر تعجب کرتے تھے۔ مَیں نے بہت سی کتابوں کے منتخب حصّے پڑھے تھے۔ کیونکہ مَیں سمجھتی ہوں کہ ان ابتدائی دنوں میں شاید مَیں نے ایک بھی کتاب مکمل نہیں پڑھی تھی۔ مَیں نے نظم کا بہت سا حصّہ کسی نافہم طریق پر پڑھا تھا۔ تا آنکہ مجھے ایک کتاب "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" ملی، یہی وہ پہلی قابلِ قدر کتاب تھی

جیسے میں نے سمجھ کر پڑھا تھا۔ ایک دن میری اُستانی نے مجھے کتب خانہ کے ایک کونے میں مشہور ناول "سُرخ چٹھی" کے صفحے اُلٹتے ہُوئے پایا، اس وقت میری عمر تقریباً آٹھ برس کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اُستانی صاحبہ نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ کہ تم "ننھے موتی کو پسند کرتی ہو" اور اُنہوں نے بعض الفاظ کی تشریح کی تھی۔ جو میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ اس کے بعد اُنہوں نے مجھے بتلایا۔ کہ ایک چھوٹے لڑکے کے متعلق ایک نہایت خوبصورت کہانی ان کو معلوم ہے۔ جو مجھے "سُرخ چٹھی" سے زیادہ پسند آئیگی۔ اس کہانی کا نام "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" تھا۔ اور اُنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اسے آئندہ موسم سرما میں مجھے پڑھ کر سنائیں گی۔ لیکن ہم نے اس قصّے کو اگست سے پہلے شروع نہیں کیا۔ کیونکہ ساحلِ سمندر پر میرے قیام کے ابتدائی چند ہفتے نئے دلولوں اور نئی نئی دریافتوں سے اسقدر لبریز تھے۔ کہ میں کتابوں کا وجود ہی بھول گئی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کے لئے میری اُستانی صاحبہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بوسٹن میں چند دوستوں سے ملنے چلی گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" کی کہانی کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے وہ جگہ اور وقت بخوبی یاد ہے۔ جبکہ ہم نے اس دلچسپ بچوں کی کہانی کے ابتدائی ابواب کو پڑھنا شروع کیا تھا۔

اگست کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ اور ہم سے کچھ فاصلے پر، دو شاندار چیڑ کے درخت تھے۔ ہم ان درختوں سے بندھے ہُوئے ایک جھولے دار بستر پر بیٹھی تھیں۔ ہم دوپہر کے کھانے کے بعد جلد جلد برتن صاف کر چکی تھیں تاکہ ہمیں اس کہانی کے پڑھنے کے لئے سہ پہر کا زیادہ سے زیادہ حصّہ مل سکے۔ جب ہم لمبی گھاس میں سے جلد جلد جھولے دار بستر کی طرف گئیں، گھاس کے ٹڈے ہمارے اردگرد جھنڈ بنا کر پھدکتے ہُوئے ہمارے لباس پر آبیٹھے اور مجھے یاد ہے کہ اُستانی صاحبہ نے اس امر پر اصرار کیا تھا، اگرچہ یہ اصرار دراصل تضیع اوقات تھا کہ بستر پر بیٹھنے سے قبل مجھے ان تمام ٹڈوں کو پکڑنا چاہیئے۔ بستر میں چیڑ کے سوزن نما پتے بھرے ہُوئے تھے۔ کیونکہ اُستانی صاحبہ کی غیر حاضری میں اس کا استعمال کسی نے نہیں کیا تھا گرم سُورج کی روشنی سے ان درختوں کی تمام خوشبو باہر نکلی پڑتی تھی۔ ہوا صحت بخش تھی۔ اور اس میں سمندری نباتات کی خوشبو پائی جاتی تھی۔ قصّہ خوانی سے پیشتر مس سلیون صاحبہ نے قصہ کے اُن تمام امور کو واضح کیا۔ جنہیں میں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اور جوں جوں ہم نے پڑھنا شروع کیا، وہ مشکل الفاظ کی تشریح کرتی گئیں۔ ابتدا میں بہت سے الفاظ سے ناآشنا تھی۔ اور اسی وجہ سے بار بار پڑھائی میں رکاوٹ واقع ہوتا تھا۔ لیکن جونہی میں قصّے کے حالات پر حاوی

ہوئی۔ پھر تو میں اس میں مشتاقانہ اتنی محو ہوئی کہ بعض الفاظ کو معانی کی غرض سے خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ اور جب اُستانی صاحبہ بعض ضروری تشریحات کرنے پر اصرار بھی کرتی تھیں تو میں نہایت بے صبری کے ساتھ اس خیال سے انہیں سُنتی تھی کہ وہ کب ختم کریں اور میں کہانی پڑھوں۔ جب ان کی انگلیاں تھک کر مزید الفاظ کے ہجا کرنے سے قاصر ہوگئیں۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنی معذوریوں کا شدید احساس ہُوا۔ میں نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔ اور اس کے حروف کو ایک شدت کی خواہش کے ساتھ جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتی ٹٹولنا شروع کیا۔ بعد ازاں میرے گہرے اشتیاق کو دیکھ کر مسٹر اینگنوز نے اس قصے کو اُبھرے حروف میں تیار کرادیا۔ اور میں نے اسے بار بار پڑھا۔ حتےٰ کہ کتاب مجھے تقریباً ازبر یاد ہوگئی۔ اور میرے تمام بچپن کے زمانے میں "چھوٹا نواب فونٹ لرائے" میرا پیارا ساتھی رہا۔ میں نے ان تفصیلات کو بیان کرنے میں قدرے بے لطف طوالت سے اس لئے کام لیا ہے کہ وہ بالعموم میرے ابتدائی مطالعہ کی غیر معین، تغیر پذیر اور دھندلی یاد کے ساتھ مقابلہ کرنے پر روشن دکھائی دیتی ہیں۔ میری کتاب بینی کی صحیح دلچسپی کی ابتدا اسی قصے سے ہوتی ہے۔ میں نے اگلے دو سالوں کے عرصہ میں گھر پر اور بوسٹن کے آنے جانے بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ مجھے

یہ یاد نہیں رہا کہ وہ کونسی کتب تھیں۔ میں نے انہیں کس ترتیب کے ساتھ پڑھا تھا۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں۔ کہ ان کتب میں "یونانی بہادر" لافونٹین[51] کے "اخلاقی قصّے" ہاتھورن[52] کا "فسانہ عجائب" "انجیلی قصّے" "شیکسپیر کی کہانیاں" مُصنّفہ لیمب[53] "بچوں کی انگلستان کی تاریخ" مُصنّفہ ڈکنز[54] "الف لیلہ" "سوِز فیملی رابنس" "حاجی کا سفر"[55] "رابنسن کروسو"[56] "چھوٹی عورتیں" اور ایک دلچسپ قصّہ

۵۱ لافونٹین مشہور فرانسیسی شاعر اور افسانہ نویس، اس کے قصّے بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ پیدائش ۱۶۲۱ء تاریخ وفات ۱۶۹۵ء (مترجم)

۵۲ نیتھینل ہاتھورن (۱۸۰۴ء – ۱۸۶۴ء) امریکہ کا نامور افسانہ نویس ہے (مترجم)

۵۳ چارلس لیمب (۱۷۷۵ء – ۱۸۳۴ء) انگریزی انشاء پرداز۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں محرر رہا۔ اس نے سب سے پہلے شیکسپیر کے ڈراموں کو نثر میں لکھا۔ (مترجم)

۵۴ چارلس ڈکنز۔ اسکا ذکر کتاب ہذا میں آچکا ہے۔ (مترجم)

۵۵ جان بنین (۱۶۲۸ء – ۱۶۸۸ء) انگریزی واعظ کی مشہور استعارہ نما تصنیف ہے (مترجم)

۵۶ ڈانیال ڈیفو (۱۶۶۱ء – ۱۷۳۱ء) کی مشہور تصنیف ہے جس میں ایک سیّاح کا کسی غیر آباد جزیرے میں پہنچکر تنہائی میں رہنے تمام سامان زیست کو مہیا کرنے کا حال درج ہے (مترجم)

"ہیڈی" تھا۔ ہے ۔ میں نے جرمن زبان میں
بھی پڑھا تھا۔ میں نے ان کتب کو مطالعہ اور کھیل کود کے
درمیانی وقفوں میں پڑھا تھا۔ جس سے مجھے اور بھی گہری
مسرت حاصل ہوتی تھی۔ میں نے ان کتابوں کو غائر نظر
سے نہیں دیکھا۔ اور نہ ان کی تحلیل کی تھی۔ مجھے یہ معلوم
نہ تھا کہ وہ تصانیف اچھی تھیں یا بُری۔ اور نہ میں نے کبھی
طرزِ کلام یا تصنیف کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا تھا۔
یہ کتب اپنے خزانے میرے آگے پیش کر دیتی تھیں۔ اور
میں انہیں اسی طرح قبول کرتی تھی۔ جس طرح انسان
سُورج کی روشنی یا دوست کی محبت کو قبول کر لیتا ہے۔
میں "چھوٹی عورتوں" کو بمقابلہ دوسری کتب کے اس لئے
زیادہ پسند کرتی تھی کہ اس کے ذریعے مجھے ان لڑکوں اور
لڑکیوں کی ہمنشینی میسر آتی تھی۔ جو دیکھ اور سُن سکتی ہیں۔ چونکہ
میری زندگی کسی طریق سے ایک محدود زندگی تھی۔ اس لئے
مجھے اس کے سوائے چارہ نہ تھا کہ بیرونی دُنیا کے حالات
معلوم کرنے کے لئے کتاب کے صفحات کو اُلٹ پلٹ کروں
میں نے "حاجی کا سفر" پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ اُسے
ختم کیا۔ یہی حال " اخلاقی قصوں" کا تھا۔ میں نے لافونٹین
کی کتاب کا پہلے تو انگریزی ترجمہ پڑھا تھا۔ اور بعد ازاں
قدرے بیدلی کے ساتھ اس کا لطف اُٹھانا چاہا پھر اس
کتاب کو فرانسیسی میں پڑھنے سے میں نے معلوم کیا کہ باوجود
الفاظ کی روشن تصاویر اور مُصنّف کی عجیب و غریب قادر الکلامی
کے میں نے اسے چنداں پسند نہیں کیا، مجھے اس کا سبب
معلوم نہیں کہ وہ قصّے جن میں حیوانات سے انسانوں کی
طرح بات چیت کرائی جاتی ہے۔ مجھے کیوں پسند نہیں
آتے تھے۔ ان میں حیوانات کے مضحکہ انگیز سوانگ تو تمام
توجہ کو کھینچے رکھتے ہیں۔ لیکن اخلاقی نتیجہ ذہن میں اُترنے
نہیں پاتا۔ مزید براں لافونٹین شاذ و نادر ہی ہماری اعلیٰ
اخلاقی قوت سے اپیل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہماری
قوائے عقلیہ اور خودپسندی کو متحرک کرتا ہے۔ اس کے تمام
قصوں میں یہی خیال جاری و ساری رہتا ہے کہ انسانی فنا
تمامتر خودپسندی کا نتیجہ ہے۔ اور اگر عقل کے ذریعہ سے
خودپسندی کی رہنمائی اور روک تھام کیجائے تو اس کا نتیجہ
راحتِ نفس ہوگا۔ جہانتک میں سمجھ سکتی ہوں خودپسندی
تمام برائیوں کی جڑ ہے لیکن میرا یہ خیال غلط ہو سکتا ہے
کیونکہ میرے مقابلے میں لافونٹین کو انسان شناسی کے
زیادہ مواقع ملے ہونگے۔ میرا اعتراض ہجوآمیز اور درشت صفت
قصّوں پر نہیں۔ بلکہ اس امر پر ہے کہ حقائق ضرور بندروں
اور لومڑوں کے ذریعے کیوں بتائے جائیں۔ مذکورہ کتب میں
"جنگل کی کہانی" اور " وحشی حیوانات" مجھے بہت پسند ہیں
مجھے ان حیوانات سے جو اس کتاب میں بیان کئے گئے
ہیں۔ ایک خاص دلچسپی ہے۔ کیونکہ انسانی کارٹون (نقل)

ہونے کی بجائے وہ اصلی جانور ہیں۔ کتاب پڑھنے سے انسان کو ان کے باہمی میل و حرب سے ہمدردی اور ان کی خوشیوں سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور ہم ان کی مصائب سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر ان سے کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ ہو سکے تو وہ اسقدر لطیف ہوتا ہے کہ بے خبری کے ساتھ دل میں اُتر جاتا ہے۔ قدامت کے تصور کی طرف میرا دل فطری طور پر مسرت کے ساتھ لپکتا تھا۔ میں یونانِ قدیم پر فریفتہ تھی۔ میں عالمِ خیال میں یونانی دیوتا اور دیویوں کو زمین پر چلتے پھرتے اور انسانوں کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھتی تھی۔ اور میں اپنے دل ہی دل میں خفیہ طور پر ان دیوتاؤں کے مندر بناتی تھی جن سے مجھے اُنس تھا۔ بحری پریوں بہادروں اور نیم دیوتا جنس کی مخلوق کے ساتھ مجھے واقفیت اور محبت تھی۔ لیکن تمام کے ساتھ نہیں کیونکہ میڈیا اور جیسن[۵۱] کی وحشت انگیز بے رحمی اور حرص میرے نزدیک ناقابلِ معافی تھی۔ اور میں حیران ہوتی تھی کہ دیوتاؤں نے انہیں بدکرداری کی کیوں اجازت دی۔ اور پھر اس پر انہیں سزا بھی نہیں دی گئی، یہ معمہ ابتک حل نہیں ہوا۔ میں اکثر اس خیال سے حیران ہوتی ہوں کہ جب خدا کی زمین پر گناہ کا اس قدر دور دورہ ہے۔ تو اس پر خدائے قدوس کیوں خاموشی اختیار کئے رکھتا ہے۔ مجھے الیئیڈ[۵۲] کے ذریعے یونان واقعی ایک بہشت دکھائی دیتا ہے۔ میں ٹرائے[۵۳] کا اصل افسانہ پڑھنے سے پیشتر ہی اس سے آشنا ہو چکی تھی۔ قواعدِ زبان کی سرحد عبور کرنے کے بعد یونانی الفاظ سے عجائبات کے تمام خزانے کھلوانے کے لئے مجھے چنداں دقت پیش نہیں آئی۔

(باقی آئندہ)

خادم محی الدین

---

۵۱ ایک قدیم یونانی قصے میں جیسن شاہ پیلیس کا بھتیجا تھا، چچا نے اس کی سلطنت غصب کر لی۔ پیلیس نے جیسن کو کولچس کی مملکت سے ایک سنہری کھال لانے پر سلطنت واپس دینے کا وعدہ کیا۔ یہ سنہری کھال کولچس میں ایک درخت پر آویزاں تھی۔ اس کے نیچے ایک اژدھا اس کی حفاظت کرتا تھا۔ جیسن نے ایک جہاز آرگو نامی تیار کرایا۔ اور چند ہمراہی ساتھ لیکر بہت سے خطرات میں سے گزرا۔ اور کولچس پہنچا۔ سنہری کھال کا حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن بادشاہ کی لڑکی میڈیا نے جیسن کو ایسے داؤ اور منتر بتائے کہ اس نے یہ مہم سر کی۔ میڈیا سے شادی کر کے شادکام ہوا۔ اور اسے ملکہ بنا کر اپنے تخت پر بیٹھا۔ (مترجم)

۵۲ یونانی نابینا شاعر ہومر کی نظمِ رزمیہ کا نام ہے۔ اس نظم میں جس قصے کا ذکر ہے وہ "ٹرائے" کا محاصرہ ہے۔ جو اس وجہ سے ہوا تھا۔ کہ یونانی بادشاہ کی حسین بیوی کو جسے سپارٹا سے پیرس نامی ٹرائے کا شہزادہ اڑا لے گیا تھا، دوبارہ حاصل کیا جائے (مترجم)

۵۳ ایشیائے کوچک میں قدیم شہر جو یونانی روایات میں مشہور ہے۔ جسے اب بنار باشی کہتے ہیں (مترجم)

قواعد و مقاصد

انجمن اربابِ علم

(۱) انجمن کے مقاصد حسب ذیل ہونگے :-

الف - مُلک میں صحیح اُردو زبان کی ترویج -

ب - سررشتہ ہائے تعلیم کی مجوزہ اُردو کتابوں پر بحیثیت صحتِ زبان تنقید -

ج - اردو اخبارات و رسائل کو جج کے طور پر زبان کی فروگزاشتوں پر توجہ دلانا -

د - اُردو زبان میں مفید تصانیف شائع کرنا -

ہ - مُلک کے اُردو اخبارات و رسائل، اور ہر قسم کی مفید تصانیف کے شمار و اعداد کی رپورٹ سالانہ شائع کرنا -

و - سررشتہ ہائے تعلیم، یونیورسٹیوں اور گورنمنٹ کو اُردو کی ترقی کے متعلق مفید مشورے پیش کرنا -

ز - اُردو کے اچھے مصنفین، شعرا اور حامیوں کی بلا امتیاز مذہب ممکن امداد کرنا -

ح - اُردو انسائیکلوپیڈیا اور ایک جامع اُردو لغات کی ترتیب کے لئے امکانی کوشش کرنا -

ط - اُردو رسم الخط کو فروغ دینا -

ی - اُردو شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کو باضابطہ بنا کر رائج کرنا -

ک - اُردو زبان کو مُلک کی مشترکہ قومی زبان (لنگوا فرینکا) بنانے کی غرض سے اس کی نظم و نثر میں

ذیل کی تجاویز کو کامیاب بنانا۔

(۱) اُردو کی عام تحریروں سے عربی، فارسی اور سنسکرت وغیرہ کے ان الفاظ کا استعمال کم کر کے جو غیر مانوس اور ناخوشگوار ہیں۔ ہندی کے سادہ اور رسیلے الفاظ کے استعمال سے اسے عام فہم بنانا۔

(۲) اُردو شاعری میں بلینک ورس (بے قافیہ نظم) کو رواج دینا اور مقفّٰے نظموں میں ہمقافیگی کی غیر ضروری پابندیوں کو کم کرنا۔

(۳) اُردو شاعری میں دوسری زبانوں اور خاصکر ہندی کے خوش آیند اوزان کو رائج کرنا۔

(۴) اُردو شاعری میں مُلکی خیالات، تلمیحات اور تشبیہات کو رائج کر کے اسے اصلی معنی میں ملکی شاعری بنانا۔

(۵) اُردو نظم کو غیر مفید اور مخرب اخلاق خیالات سے پاک کر کے مُلک و قوم کے لئے مفید بنانا۔

(۶) اُردو شاعری میں ایسی نظموں کو رواج دینا جس میں شاعر نے محبوب مخاطب عورت کو قرار دیا ہو۔

(۷) مستقبل کی عام ہندوستانی زبان کے مطابق اُردو کی گرامر تیار کرنا۔

(۸) اُردو کی نوآموز شعراء انشاپردازوں اور مصنّفین کی رہبری کرنا۔

ناٹک ساگر

اس لاجواب کتاب میں ہندوستان۔ چین۔ جاپان۔ سیلون۔ افریقہ۔ ایران۔ عرب۔ ٹرکی۔ یونان۔ اٹلی سپین پرتگال فرانس۔ جرمن۔ انگلستان۔ سویڈن۔ ناروے۔ روس اور امریکہ کے مشاہیر ڈرامہ نگاروں اور ایکٹروں کی زندگی کے حالات ڈراموں پر نقد و نظر سٹیج کی حالت بنا کر فنِ ڈراما کے رموز آشکارا کئے گئے ہیں۔ باوجود تاریخی باتوں پر مشتمل ہونے کے کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے نہیں چھوڑ سکتے۔ اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا کتب خانہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ آجکل ہندوستان بھر میں اسی کتاب کا چرچا ہے۔ ٹریبیون۔ زمیندار۔ سیاست۔ پرتاب نے زبردست ریویو لکھے ہیں۔ طباعت۔ کتابت اور کاغذ نفیس حجم قریباً ۵۰۰ صفحات۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے بلا جلد ۶؎ مجلد طلائی ۸؎ ہے۔

موجودہ لنڈن کے اسرار

اُردو زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں جو فلسفہ جرائم پر روشنی ڈالتی ہو۔ اس کتاب کی اشاعت نے بہت حد تک اس کمی کو پُورا کیا ہے۔ لنڈن کی سنسنی پیدا کرنے والی وارداتوں کو سامنے رکھکر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے کہ جرائم کے حیرت انگیز طریقے صاف نظر آجاتے ہیں۔ من گھڑت قصّہ کہانیوں کو ان حقیقی واقعات سے دُوری بھی بہت نہیں ہوسکتی مگر باوجود اس کے کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ناول بھی اس سے لگّا نہیں کھا سکتا۔ اگر آپ دُنیا میں رہ کر کسی فریب کا شکار ہونا نہیں چاہتے، تو اس کتاب کو حرزِ جاں بنایئے۔ اگر آپ تحقیق جرائم میں دلچسپی لیتے ہیں تو ہر وقت اس کتاب کو اپنے سامنے رکھئے۔ قیمت ۱۲؎

ملنے کا پتہ:-

مینجر رسالہ نونہال چیمبرلین روڈ۔ لاہور

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

جان ظرافت - ایک بزمیہ ڈرامہ ہے۔ جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی، دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ اصل کتاب مولیئر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں۔ جو جرمنی کے مشہور ڈراما نگار لیسنگ اور فارس میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدّت طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنّفین کی طبعزاد ہیں۔ غرضکہ اس زعفران کی بالیدگی کے لئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اس کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے۔ قیمت ۸ ر، ۶ ر فیجلد۔

قزّاق :- جرمنی کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھالکر دنیا کے نشیب و فراز، اعمال بد کے مآل کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو لبھاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اُردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصوّر کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ کنور سین صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لا، چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر اسے ازحد دلچسپ خیال فرماتے ہیں۔ قیمت فیجلد ۸ ر۔

ظفر کی موت :- بلجیم کے چابکدست اور محیر العقول ڈراما نگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جسمیں ایک ان کی محبت کا جلوہ دکھاکر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جن کا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا نہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیت ہے عجیب پُر تاثیر کتاب ہے جسکے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے قیمت ۴ ر

بگڑے دل :- فرانس کے ستم ظریف ڈراما نگار مولیئر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ مبصروں کی رائے میں حسن زبان، انداز بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیات عالم میں ناپید ہے اور شعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے۔ اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن کن اُلجھنوں میں پھنستا ہے قیمت فیجلد ۸ ر

تین ٹوپیاں :- جو دورِ جدید کی ایک فرانسیسی فارس کا عکس ہے۔ قیمت فیجلد ۸ ر

ملنے کا پتہ :- **مینجر دی اُردو ہاؤس چیمبرلین روڈ۔ لاہور**

اُردو کا ماہانہ رسالہ شمع۔ آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ، غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا۔ پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں۔ اور فنِ اخبار نویسی سے واقف ہیں۔ اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ اس میں کوئی ذاتی فایدہ شامل نہیں۔ اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندی وقت سے شائع ہوتا ہے تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ چھ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۱۰/

المشتہر منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہگنج آگرہ

آسمان نسائیت کا آفتاب درخشاں

یعنی

نور جہاں

افق صحافت سے طلوع ہو گیا

اور اس بدیع المثال زنانہ رسالہ کا نمونہ کا نمبر ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو گیا۔ جو پچیس نہایت پُر مغز اور مفید و دلآویز مضامین سے پُر ہے۔ جس میں زمانہ بھر کی نسوانی تحریکوں پر نظر ڈالنے کے علاوہ عورت کی زندگی کے مختلف علمی و عملی پہلوؤں پر نامور اہلِ قلم اصحاب نے لطیف روشنی ڈالی ہے۔ ارباب نظر نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس پایہ کا کوئی زنانہ رسالہ زبانِ اُردو میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوا۔ اس کا حجم ۸۰ صفحات ہے آپ ۹/ آنے کے ٹکٹ بھیج کر نمونہ طلب کیجئے۔ یا پانچ روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر سال بھر تک اس کا لطف اُٹھائیے۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں رسالہ کا پہلا باقاعدہ نمبر شائع ہو جائیگا۔ جلد اپنی درخواستیں مع زر چندہ بھیجئے۔ اور انعامات کے مقابلہ میں شامل ہو جائیے۔

مینیجر نور جہان امرتسر

ہزار داستان

جلد (۸) فہرست مضامین بابت ماہ فروری ۱۹۲۶ء نمبر (۲)

فہرست تصاویر

محمد حسین آزاد

ؔمدت ہوئی لاہور میں ایک انجمن "ینگ مین محمڈن اسوسی ایشن" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ جس کی فرمائش پر خان بہادر شیخ عبدالقادر نے ادب اردو کے اساتذۂ حال کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ تیار کیا تھا۔ اور یہ مضامین وقتاً فوقتاً انجمن مذکور کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ ذیل کے صفحات انہی میں سے ایک مضمون کا رواں ترجمہ ہیں) ہادی

مولانا محمد حسین آزاد جن کی ادبی کارگزاریوں سے میں آج کی تقریر میں بحث کرنا چاہتا ہوں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ غالباً پنجاب کا کوئی نوجوان، عام اس سے کہ وہ طالب علم ہو یا فارغ التحصیل ہو چکا ہو، ایسا نہ ہوگا جو ابتدائے عمر ہی سے آپ کے نام نامی سے واقف نہ چلا آیا ہو۔ ہم سب کی طالبعلمانہ زندگی کا وہ دور جس کی یاد ہمیں بیحد عزیز ہوتی ہے، محمد حسین آزاد اور ان کی تصنیفات سے ایک ایسے مستحکم رشتے میں مربوط ہے جو کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ پنجاب کے باہر آپ کو ایسی عام شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اور اگر کسی قدر شہرت حاصل ہوئی بھی ہے تو آپ کی وہ قدر و منزلت نہیں کی گئی جس کے آپ حقدار تھے۔ بہرحال پنجاب پر آپ کے حقوق کچھ اسی حیثیت سے نہیں کہ آپ ایک ایسے جلیل القدر انشا پرداز تھے۔ جن کی تحریروں نے ادبِ اردو پر نہایت گہرا اثر کیا۔ بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ آپ کا نام ڈاکٹر لیٹنر اور کرنل ہالرائڈ جیسے فضلائے اکمل کے پہلو بہ پہلو اشاعتِ تعلیم کے ان سرگرم علمبرداروں کی فہرست میں ہے۔ جن کے احسان کا معاوضہ پنجاب کبھی نہ ادا کر سکیگا۔ اس کے علاوہ آپ ان معدودے چند بزرگوں میں تھے جو یوں تو اگلے وقتوں کے ماحول کے تربیت یافتہ اور پرانے خیالات کے لوگ تھے لیکن جب نئی تعلیم کا چرچا ہوا، تو ان کی دور رس نگاہوں نے ان مصالح کا جو اس کی تحصیل میں مضمر تھے۔ فوراً اندازہ کر لیا۔ اور انہوں نے جہاں تک ہو سکا۔ اس کی ترویج و اشاعت میں مدد دی۔ خصوصاً لاہور پر آزاد کے حقوق بیحد و حساب ہیں۔ کیونکہ یہ وہ جگہ تھی، جسے آپ نے اپنا وطنِ مالوف بنایا۔ یہی آپ کی تعلیمی مصروفیتوں کا مرکزِ عمل تھا۔ اور اسی کی خوشگوار فضا میں آپ نے اپنی بہترین ادبی خدمات انجام دیں۔ ان وجوہ کی بنا پر محمڈن ینگ مین ایسوسی ایشن کے لئے یہ امر نہایت زیبا اور مستحسن ہے کہ اس نے موصوف کے نام کو عہدِ جدید کے ان اعاظم ادبا

کی ذیل میں جن کے کارناموں کی نسبت مدّت ہوئی ایک
سلسلۂ خطبات کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ شامل کرکے اُن
کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے
پہلا نام مولانا حالی کا تھا۔ اور اُن کے کارناموں سے بحث
کرنے کی خدمت میرے ہی سپرد کی گئی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر
بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ ابکے جو موضوع میرے لئے تجویز
کیا گیا ہے اُس میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ تنوع اور تفصیل
کی گنجائش ہے۔ اور جو کچھ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے اُس
کے اعادے کی ضرورت نہ پیش آئیگی۔ کیونکہ ان دو مصنّفین
کی ادبی زندگیاں ایک دوسری سے اساسی طور پر مختلف
ہیں۔ مولانا حالی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے
میں نے کہا تھا کہ اُن کا حقیقی جوہرِ کمال شاعری ہے۔ اور
بحیثیت نثر نویس کے اُنہیں کوئی خاص امتیاز حاصل
نہیں۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد سب سے پہلے ایک
اعلےٰ درجے کے نثر نویس ہیں، اور اسکے بعد کچھ اور، گو نظم میں بھی اُنکی
بعض چیزیں ایسی ہیں جو تعریف کے قابل ہیں۔ تاہم
ان کی بنا پر اُنہیں "اقلیمِ سخن کے تاجداروں" میں جگہ نہیں
دیجا سکتی۔ جو اشتہار اس جلسے کے متعلق شائع کئے گئے ہیں
اُن کے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ سکرٹری صاحب نے
مجھ سے مشورہ کئے بغیر آپ کو اس توقع باطل میں مبتلا کر دیا
ہے۔ کہ میں مولانا آزاد سے اولاً بحیثیتِ شاعر اور ثانیاً بحیثیت
نثر نویس کے بحث کرونگا۔ میں آغازِ کلام سے پہلے ہی آپ
کی خدمت میں عرض کر دوں کہ میرا ارادہ ہرگز ایسا نہیں ہے
سیکرٹری صاحب نے صرف یہی نہیں کیا کہ مجھ پر آزاد کے
دعوئ شاعری کا فیصلہ کرنے کی مزید ذمہ داری عاید کر دی
ہے۔ جس کے قبول کرنے کا نہ مجھے پہلے خیال تھا، اور نہ اب
ہے۔ بلکہ اس پر طرّہ یہ کہ وہ لفظ "شاعر" کو لفظِ "نثر نویس"
سے زیادہ اہم سمجھنے کے عام مغالطے میں مبتلا ہو گئے ہیں۔
چنانچہ اُنہوں نے اشتہار کی عبارت میں "شاعر" کو "نثر نویس"
پر بعینہٖ اسی طرح تقدّم کا شرف بخشا ہے۔ جس طرح آجکل
جلسوں میں قدرتی طور پر پہلے "لیڈیز" اور اس کے بعد
"جنٹلمین" سے خطاب کیا جاتا ہے! بہرحال یاد رکھنا چاہئے
کہ ہر مصنّف کی کوئی نہ کوئی امتیازی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جو صرف
اُسی کا حصّہ ہوتی ہیں۔ اور کوئی مصنّف جس وقت اپنی حدود
سے باہر نکلکر دوسروں کی حدود میں مداخلت کرنا چاہتا ہے
تو پھر اُس کی وہ حیثیت نہیں رہتی۔ اس لئے اگر کسی مصنّف
کی نسبت یہ کہا جائے، کہ وہ ایک شعبۂ ادب میں کامیاب
ہے، اور دوسرے میں نہیں، تو اس سے اس کی کسرِ شان
نہیں ہوتی۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ ایک طرف جتنی زیادہ
توجہ ہوگی اتنی ہی دوسری طرف کم ہوگی۔ مثال کے طور پر
انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ ٹینی سن ہی کو لیجئے۔ نظم میں اُن
کا کتنا بڑا رتبہ ہے! لیکن اُن کی نثر اعلےٰ درجے کی نثر کے

معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اسی طرح اُن کے بلند پایہ ہمعصر طاس کارلائل کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اگر شعر کہنے کی کوشش کرتے بھی تو مشکل تھا کہ کوئی شاندار کامیابی حاصل کر سکتے اور اسے اُن کی انتہائی معاملہ شناسی کہئے کہ وہ اس طرف ملتفت ہی نہیں ہوئے۔ غرض میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد نثر کے مرد میدان ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ شاعری اُن کے حیطۂ قدرت سے خارج تھی یہ محض اُن کے گردوپیش کے حالات اور اتفاقاتِ وقت کا نتیجہ تھا۔ کہ اُنہوں نے شعر گوئی کی بجائے نثر نگاری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ورنہ انہیں فطرت نے شاعر ہونے کی صلاحیت بھی کچھ کم ودیعت نہ کی تھی۔ میرا عقیدہ ہے۔ کہ اگر وہ اپنے وقت سے ایک صدی پہلے پیدا ہوتے تو اُردو کے شاعروں میں بھی اُتنا ہی امتیاز حاصل کرتے، جتنا اُنہوں نے نثر نگاروں میں کیا ہے۔ جن حالات میں اُن کی پرورش ہوئی ہے، اُنکا تقاضا تو یہی تھا کہ اُن کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا۔ اُن کی پیدائش دلّی میں ایسے وقت ہوئی ہے جبکہ شعرائے متاخرین کا زمانہ تھا۔ جمہور کا مذاق شاعری کی نشوونما کے لئے موافق تھا۔ اور ذوق وغالب کے معرکوں کی گرم بازاری تھی۔ ان حالات کے ماتحت ہر کس و ناکس شاعری کا شوق لیکر پیدا ہوتا تھا۔ جیسے آئے دن کے

مشاعرے اور شعراء کی ہم نشینی کے موقعے اور بھی ترقی دیتے تھے۔ پھر آزاد جن کے انداز و اطوار جوانی کے بعد بھی جنکو ہمیں اُنکے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُن کی شاعرانہ فطرت کی غمازی کرتے تھے۔ ان سے متاثر ہوتے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے؟ لیکن اُنہوں نے محسوس کیا کہ اُردو کی شاعری اپنی پُرانی پابندیوں اور قدیم رواج کی زنگ آلود زنجیروں میں مقیّد رہ کر جس معراج تک پہنچ سکتی تھی پہنچ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُس قدامت پسندی اور اسلاف پرستی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ جو اُن کے اہلِ مُلک کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اس لئے اُنہوں نے سوچا کہ ان پابندیوں سے آزاد ہو کر زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق کوئی نئی چیز مُلک کے سامنے پیش کی گئی، تو اسے قبول عام حاصل ہونا معلوم۔ علاوہ بریں قدیم اسلوبِ سخن کی وقعت اُن کے دل میں اتنی کم نہ تھی۔ اور وہ اُن خصوصیات کی قدر شناسی سے جنہیں مُدتوں سے داخلِ محسنات سمجھا جاتا تھا۔ ایسے عاری نہ تھے۔ کہ اُن کی طبیعت اس راہ سے انحراف کرنا گوارا کرتی بالخصوص اُن بیل بوٹوں کی جو اس کے کنارے سالہا سال کی روئیدگی اور ہزاروں شاعروں کے خونِ جگر سے پیدا ہوئے تھے۔ کاٹ چھانٹ پسند کرتے۔ دوسری طرف اُنہوں نے یہ محسوس کیا کہ جہاں اشعار کے انبار در انبار مجموعے بآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں،

وہاں نثر کی کوئی ایسی کتاب ہاتھ لگنی مشکل ہے جو ادبی لحاظ سے کسی خوبی کی حامل ہو۔ اور اہلِ زبان کے روزمرّہ میں لکھی گئی ہو۔ یوں تو اکّا دکّا قصّے کہانی کی کتابیں تھیں۔ یا قرآن و حدیث اور طبّی کتابوں کے کچھ ترجمے موجود تھے۔ مگر اُنکی عبارت بھی یا تو ایسی ادق اور علمی و اصطلاحی تھی۔ کہ عام لوگوں کیلئے اس کا سمجھنا دشوار تھا یا ایسے طرز کی تھی۔ جو محاورۂ حال سے بالکل مختلف تھا۔ اور اس لئے اُن سے کسی عملی فایدے کی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ اسوجہ سے آزاد نے ایک نئی راہ کی داغ بیل ڈالی۔ خوش قسمتی سے زمین زرخیز تھی، جو بیج اُنہوں نے اور اُن کے ہمخیال معاصرین نے بوئے، وہ پھل لائے۔ اور اُن کا نتیجہ وہ سرسبز و شاداب پیداوار ہے جو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ اور جس کے پھلنے پھولنے کی بشرطِ آبیاری آیندہ بھی امید ہے۔ یہ نئی راہ اختیار کرنے کے لئے انہیں اپنے طبعی رجحانات سے یقیناً بے اندازہ کشمکش کرنی پڑی ہوگی۔ اور جس ایثار سے کام لے کر اُنہوں نے اپنے مذاق کے خلاف اپنی قوتوں کو صرف کیا۔ وہ بیحد قابلِ تعریف ہے ملک و قوم کے فایدے کی خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے اور شخصی رجحانات کو اس طرح پس پشت ڈال دینا یقیناً ایک ادبی شہادت ہے۔ اور مولانا آزاد جنہوں نے اپنی پسندِ طبع سے اعراض کرنے کے علاوہ ادبی مشاغل کے مقابلے میں اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی۔ حتےٰ کہ اخیر عمر میں وہ اپنی جوانی کا ایک بگڑا ہوا نقشہ ہو کر رہ گئے! اور وں سے کہیں زیادہ اس عظیم الشان درجے کے مستحق ہیں۔ خیر مؤخرالذکر ایثار کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئیگا۔ سردست ہم اُن کی بعض تصانیف سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے بیحد افسوس ہے کہ بدقسمتی سے اس مُلک میں ہمیں اپنے مشاہیر کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق اتنا مواد نہیں مِل سکتا کہ ہم اُن کی زندگی کے اُس ضروری حصّے کا جس میں اُن کے تمام اوصاف کی نشو و نما ہوتی ہے۔ بالتفصیل ذکر کر سکیں۔ اشخاص مذکور خود یہ کمی پُوری کر دیں۔ تو اور بات ہے۔ ورنہ ہمارے یہاں کی اکثر و بیشتر سوانحعمریاں تمہیدی واقعات سے یا تو بالکل معرّا ہوتی ہیں۔ یا اُن کی طرف فقط اجمالی اشارات پر قناعت کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کسی شخص سے اُس وقت روشناس کیا جاتا ہے۔ جب وہ اپنی عملی زندگی شروع کر چکا ہو، بالفاظ دیگر ارتقا کا ایک ایسا حادثہ جو ظہور میں آچکا ہے ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ اسباب و علل جن کے ماتحت وہ رونما ہوا، وہ موثرات جو اُس شخص کی سیرت کی تشکیل میں برروئے کار آئے۔ اور وہ مدارج نشو و نما جن سے یکے بعد دیگرے گزر کر وہ اپنے منتہائے ترقی پر پہنچا۔ ہماری نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

مثلاً اگر مَیں کوشش کروں، تو آزاد مرحوم کی شبیہ آپ کے سامنے اس طرح پیش کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔ کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے، کسی قدر انبوہ ریش، میانہ قد بلکہ پست قد، سیدھے سادے کپڑے پہنے ہوئے، سر پر ایک پگڑی ہے، جو ایک ایسی جگہ پیدا ہونے کا پتہ دیتی ہے جہاں آجکل لوگ اسے بارِ دوش سمجھنے لگے ہیں اور اور اس پر ہلکی پھلکی ٹوپیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ پان کھاتا ہوا لاہور کی سڑکوں پر چلا جا رہا ہے۔ اور اگر مَیں ذرا زیادہ کوشش کروں، تو یہ بھی ممکن ہے کہ تصویر منہ سے بول اُٹھے، یعنی مرحوم کی وہ باتیں جن میں بذلہ سنجی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی لیکن شائستگی اور تہذیب کے ساتھ اور جو روتوں کو ہنساتی تھیں لیکن کسی کی تضحیک نہ کرتی تھیں۔ اور کسی کے جذبات کو صدمہ نہ پہنچاتی تھیں، یا اُن کی وُہ پُرمغز تقریریں جو اُس متانت اور سنجیدگی کے لہجے میں ادا ہوتی تھیں، جو ایک عالم کے شایانِ شان ہے۔ آپ کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ یا زیادہ سے زیادہ مَیں یہ کر سکتا ہوں کہ ایک قدم اور آگے بڑھاؤں، اور آپ کو اُن کے گوشۂ خلوت میں لیجاؤں۔ جہاں آپ اُنہیں نئی اور پُرانی کتابوں کے انباروں میں محصور، مطالعہ میں محو، یا قلم دانتوں میں دبائے فکرِ تحریر میں غرق دیکھ سکیں۔ لیکن اگر مَیں یہ چاہوں کہ اس نو عمر لڑکے کی صورت و سیرت کا نقشہ آپ کے پیش نظر کر دوں، جو بڑا ہو کر اس تصویر کا جس سے مَیں ابھی آپ کو روشناس کرا چکا ہوں، اصل بنا، اور جسکے ناصیۂ حال پر قیافہ شناس نگاہوں کو خداداد جوہرِ طبع کے آثار نظر آتے ہوں گے یا اگر مَیں یہ کوشش کروں کہ وہ طفلانہ شوخیِ طبع جو بعدہٗ اس ہر دلعزیز بذلہ گوئی اور دلخوش کن ظرافت میں تبدیل ہو گئی۔ اور وہ مطالعہ کا ذوق و شوق جس کا نتیجہ تبحرِ علمی کی صورت میں رونما ہوا بیان کروں تو یہ ایک مشکل امر ہے بہر حال اگر تخیّل کا رنگ و روغن کسی طرح اس تصویر کے خطّ و خال کو مکمل کر سکتا ہے۔ تو مَیں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا۔ مَیں بعض ایسی صورتوں میں کہ ناکافی معلومات کی وجہ سے کسی شخص کی زندگی کا خاکہ نامکمل رہ جاتا ہو، اپنی طرف سے اضافہ کر دینے کو جائز سمجھتا ہوں۔ کوسنٹ کو دیر جن کا شمار آجکل کے مشہور ماہرانِ طبیعی میں ہوتا ہے۔ اس طریقے پر عمل کرتے ہیں، اور اس میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ اگر اُنہیں کسی ایسے جانور کے، جو کسی منقطع النسل نوع سے تعلق رکھتا ہو، کوئی آثارِ باقیہ ہاتھ آجائیں، تو وہ اپنی قوتِ تخیّل سے کام لے کر اُس کی ترکیب جسمانی کا مکمل نقشہ تیار کر سکتے ہیں۔ ان کے بعض اس قسم کے تخیّلی نقشوں کا پُرانے وقتوں کے جانوروں سے، جن کا ذکر تاریخ اور قصّوں کی کتابوں میں آتا ہے۔

مقابلہ کر کے دیکھا گیا ہے، اور وہ ایک ایک جزئی تفصیل میں اُن سے مشابہ پائے گئے ہیں۔ اگر کونٹ کو ویر کی سی قوّتِ مشاہدہ میسّر آ جائے، تو یہ بتانا بالکل سہل ہو جاتے کہ کسی شخص کی شکل و صورت اپنی عمر کے کسی حصّے میں کیسی تھی۔ بہر حال مجھے اس کا دعویٰ نہیں، اس لئے میں اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں، کہ محمد حسین آزاد نے اپنی نسبت جو اشارے کہیں کہیں اپنی تحریروں میں کئے ہیں، اُن کو پیش نظر رکھ کر ایک خاکہ تیار کروں اور اُس میں اپنی طرف سے رنگ بھر کر جہاں تک ممکن ہو تصویر کی فروگزاشتیں پوری کر دوں۔

آزاد نے اپنے والد کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ استعداد اور بامذاق آدمی تھے۔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ کے دوستوں اور مدّاحوں میں تھے۔ اپنے بیٹے کی ابتدائی تعلیم میں انہوں نے نہایت غور و پرداخت سے کام لیا۔ جتنے کہ جب تک اُس نے سخن فہمی کی قابلیّت نہیں پیدا کر لی کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہونے دیا۔ کہ مبادا شعر و سخن اُس کے لئے تفریح کا مشغلہ ہو کر رہ جائے۔ جب ذرا تعلیم میں ترقی ہوئی تو اپنے ہمراہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں لے جانے لگے۔ یہ ایسی صحبتوں میں شریک ہونا اور اپنے وقت کے اُستادوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ اور آزاد نے جو علمی ذوق اپنے والد کی توجّہ اور شفقت کی بدولت اوائل عمر ہی میں پیدا کر لیا تھا، جو فروغ بھی حاصل کرنا کم تھا۔

(باقی دارد)

شیخ عبد القادر

وجدانیات

موجہائے جلوۂ ایمن کہاں
اب وُہ حسنِ زندگی دُشمن کہاں

آہ وہ مہکے ہُوئے پھُولوں کے ہار
وصل وعشرت کی شب روشن کہاں

رحم شیون پر اُنہیں آتا مگر
دِل حریفِ ذلّتِ شیون کہاں

مُسکرا دیتے ہواب شکووں پہ تُم
اب وہ اندازِ خمِ گردن کہاں

ہائے وہ عہدِ محبت کی غزل
آہ وہ اندازِ آتش زن کہاں

اس گل خوبی سے تھی ساری بہار
اب فروغ نزہت گلشن کہاں

پی چکے صہبائے رنگیں پی چکے
کیفہائے چشم جادو فن کہاں

چشمِ پرنم کی بہاریں ہو چکیں
حسرتِ رنگینیٔ دامن کہاں

دِل کی تاریکی غریقِ نور ہو
ساقیا وہ بادۂ روشن کہاں

بجلیوں سے عشق ہے عابد مجھے
اب غمِ بربادی خرمن کہاں

عابد

پُرانی دِلّی کا آخری چراغ

(۱)

جنھوں نے ۱۸۸۱ء میں دہلی کا چاندنی چوک دیکھا ہے۔ اُنہوں نے سُبھاگی کا بھاڑ ضرور دیکھا ہوگا۔ آج وہ بھاڑ نظر نہیں آتا۔ نہ شام کے وقت اُس کا دُھواں ساحرانہ انداز سے آسمان کی طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ پوربی عورتوں کا جمگھٹا۔ وہ غریبوں کا ہجوم۔ وہ بچّوں کا شور و غل جس پر سے گوش نواز نغموں کی موہنی قربان کی جاسکتی ہے۔ یہ سب عہدِ ماضی کی بھولی ہوئی کہانی ہوگیا ہے۔ اس کی جگہ اب ایک عالیشان دُکان کھڑی ہے۔ جہاں امیروں کے تانگے اور موٹر آکر رُکتے ہیں۔ کبھی وہاں سبھاگی کا بھاڑ گرم ہوتا تھا۔ اور غریب لوگ آکر اناج بھنواتے تھے۔ سبھاگی بدشکل عورت تھی۔ عمر بھی چالیس سے کم نہ ہوگی۔ اُس کی آواز سے ڈر آتا تھا۔ رات کو کسی ویران جگہ میں دیکھ کر اُس پر چڑیل کا شبہ ہونا بالکل قدرتی تھا۔ مگر چاندنی چوک میں وہ ایسی شان کی زندگی بسر کرتی تھی جیسی راج محلوں میں رانیوں کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ اُس کے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا۔ نہ مخملی اور اطلسی لباس تھے۔ بھاڑ جھونکنے سے اُسے بمشکل تمام اسی قدر یافت ہوتی تھی جس سے جسم و رُوح کا تعلق قائم رہ سکے۔ اس سے زیادہ کمائی اُس کے لئے ناممکن تھی۔ مگر اُس کے پاس ایک چیز ایسی تھی، جو نہ شاہی محلوں میں ہے، نہ خزانوں میں۔ اُس کے پاس دل کا اطمینان اور راحت کی نیند تھی۔ جسے نہ چور چُرا سکتا تھا۔ نہ بادشاہ چھین سکتا تھا۔ وہ اُنیسویں صدی میں رہتے ہُوئے چودھویں صدی کی زندگی بسر کرتی تھی جیسے کسی کے چاروں طرف آگ کے جانسوز شعلے بھڑک رہے ہوں۔ مگر وہ سرد و شیریں پانی کے چشمہ کے کنارے بیٹھا اس کی جان بخش و رُوح پرور لہروں سے کھیل رہا ہو۔ اور اسے اس امر کی کوئی پروا نہ ہو۔ کہ میرے چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے۔ سمجھتا ہے۔ یہاں پانی ہے۔ اس پر آگ کے شعلوں کا اثر نہ ہوگا۔ ادھر کا رُخ کریں گے، تو آپ ہی سرد ہوجائینگے۔ میرا کیا بگاڑ لینگے۔ یہی حالت سبھاگی کی تھی۔ اُس نے اپنی زندگی کی چالیس بہاریں اسی بھاڑ اور اس سے متعلقہ جھونپڑے میں بسر کی تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر اس کے تن مردہ میں جان آجاتی تھی۔ دہلی بدل گئی، چاندنی چوک بدل گیا۔ مکان بدل گئے، یہانتک کہ دہلی

کے رسم ورواج تک تبدیل ہو گئے۔ لیکن سہاگی اور اُس کے بھاڑ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اگر قدرت کے قاعدے تبدیل ہو جاتے، اور زمین کی کچی مٹی کو اپنے نگلے ہوتے مُردے اُگلنے کی اجازت ہو جاتی، تو وہ پہچان نہ سکتے کہ یہ وہی دِلّی ہے۔ مگر سہاگی کے بھاڑ میں آکر اُن کے پاؤں رُک جاتے اور وہ اپنی رُوح کی کامل قوت سے چلّا اُٹھتے کہ یہ وُہی دِلّی ہے۔ سچ پوچھو تو یہ سہاگی کا بھاڑ نہیں تھا نئی دِلّی کے مردہ جسم میں پرانی دِلّی کی رُوح روشن تھی۔ یہ جھونپڑا نہیں تھا۔ دِلّی کی تاریک روشنی میں قدیم ہندوستان کا دیا جل رہا تھا۔ آج وہ سادگی کی رُوح، وُہ قناعت کی جان کہاں ہے؟ وہ گئے گزرے زمانہ کی آخری یادگار کہاں چلی گئی۔ کس دیس کو؟ دِلّی کے بازار اس کا جواب نہیں دیتے پہلے مندر گیا تھا۔ اب دیا بھی نظر نہیں آتا۔

سہاگی کا جھونپڑا امیرانہ فلک بوس عالیشان عمارتوں کے درمیان گھرا ہُوا اس طرح کھڑا تھا جیسے غرور و تکبّر کے درمیان حقیقی خوشی کھڑی مُسکرا رہی ہو۔ اُسے کسی سے ڈاہ نہ تھا۔ بلند اٹاریوں کو دیکھ کر اُس کے دِل میں جلن نہ ہوتی تھی۔ اُس کے لئے وہ جھونپڑا اور وہ بھاڑ ہی سب کچھ تھا۔ تیس سال گزرے، جب اُس کا بھڑبھونجا اُسے بیاہ کر لایا تھا۔ جب سے وہ یہیں تھی۔ اُس نے عہد کیا تھا کہ یہاں سے مرکر ہی نکلوں گی۔ مرتے وقت اُس کے شوہر نے کہا تھا

میں تجھے لینے آؤنگا۔ یہ بات سہاگی کے دل میں بیٹھ گئی تھی عام عورتیں اس بات کو بے معنی اور لایعنی کہکر بھول جاتیں مگر سہاگی پُرانے زمانے کی ناتعلیم یافتہ عورت تھی، وہ اپنے خاوند کے عہد کو کس طرح بُھول جاتی۔ یہ اس کے سوامی کا بچن تھا۔ سوچتی تھی کون جانے، وہ کس وقت آجائے۔ اُس کی رُوح اس جھونپڑے کو۔ اس بھاڑ کو ڈھونڈیگی۔ میرا نام لے لے کر پُکاریگی۔ پُرانے زمانے کا بھڑبھونجا نئی دِلّی میں گھبرا جائیگا۔ اگر یہ جھونپڑا ذرا بھی بدل گیا، تو وُہ پہچان نہ سکیگا۔ سمجھیگا سہاگی نے بیوفائی کی۔ محبت کا دِیا ہوا کے جھونکوں سے بُجھ گیا۔ اور یہ وہ خیال، وہ جذبہ تھا جس کے لئے سہاگی عورت ہو کر تمام جہان کی مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔ جسم بدصورت تھا۔ مگر اس کے اندر دھڑکنے والا دل کیسا خوبصورت تھا۔ لوہے کی کان میں سونے کا ڈلا چھپا تھا۔ مگر زمانے کی کم نگاہی نے اُسے شناخت نہ کیا۔

(۲)

اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ اور بدل جانیوالی دُنیا میں نہ بدلنے والی سہاگی اُسی طرح اپنے پردیسی پیا کا رستہ دیکھتی رہی۔ مگر اُسے اس کی سُدھ نہ آئی۔ یہانتک کہ چاندنی چوک کے متموّل تاجروں کی ہوسناک نگاہیں سہاگی کے جھونپڑے کی طرف اُٹھنے لگیں۔ ایسے اشتیاق

سے کوئی عاشق جانباز اپنے طرحدار محبوب کی طرف بھی نہ تاکتا ہوگا۔ سوچتے تھے کیسی عمدہ جگہ ہے۔ یہاں دکان بنے تو سینکڑوں روپیہ کرایہ آئے۔ کئی امیروں نے کوشش کی۔ تھیلیاں لیکر سبھاگی کے پاس پہنچے۔ مگر سبھاگی نے بے نیازی کی شان سے اُن کی طرف دیکھا۔ اور کہا "یہ جھونپڑا نہ بیچونگی یہاں میرا سوامی بٹھا گیا ہے۔ مجھے لینے آئیگا۔ تو کہاں ڈھونڈیگا۔ یہ جھونپڑا نہیں تیرتھ راج ہے۔ اسے بیچدوں تو میرا بھلا کس جگ میں ہوگا۔"

ایک تاجر نے کہا "سبھاگی! وہ اب واپس نہ آئیگا انھونی بات بھی کبھی ہوئی ہے۔ تو یہ آس چھوڑ دے۔"

سبھاگی نے جواب دیا "پر اُسکا بچن کیسے جھوٹا ہو جائیگا۔ وہ لفظ میرے کانوں میں ابتک گونج رہے ہیں۔"

ایک اور ظاہردار نے کہا "اس عمر میں اتنی محنت کیوں کرتی ہے۔ جھونپڑا بیچ دے اور بھگوان کا بھجن کر۔"

سبھاگی نے جواب دیا۔ "یہ جھونپڑا گیا۔ تو بھجن کی سدھ بھی جاتی رہیگی۔ جس نے پیا کو بھلا دیا۔ وہ بھگوان کو خاک یاد رکھے گی۔"

ایک مُنہ پھٹ نے کہا۔ "تو سٹھیا گئی ہے۔ روپے لے، اور چین کی بنسری بجا۔ ساری عمر بھاڑ جھونکتے گذر گئی طبیعت سیر نہیں ہوئی کیا؟"

سبھاگی بولی۔ "یہ تو جنم کا کام ہے۔ مرنے پر ہی چھٹے گا۔ چار دن کے آرام کی خاطر اپنا گھر کس طرح بیچدوں۔"

"مگر اس گھر میں ہے کیا؟"

"مرنے والے کی یادگار ہے۔"

"تُو تو باولی ہوگئی ہے۔"

"بھگوان اسی طرح اُٹھالے۔ یہی پرارتھنا ہے۔ تم اپنے روپے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ میرے لئے یہ بھاڑ ہی سب کچھ ہے۔"

"ہم تمہیں اور مکان دے دینگے۔"

"پرائی چیز اپنی کیسے بن جائیگی۔"

"اُس میں ہر طرح کا آرام ہوگا۔ یہ مکان تو کسی کام کا نہیں۔"

"اپنا بچہ بدصورت بھی ہو، جب بھی پیارا ہی لگتا ہے۔"

اسی طرح ترغیب نے بیسیوں حملے کئے۔ مگر قناعت کے سامنے کوئی پیش نہ گئی۔ جس طرح پانی کی لہریں چٹان سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

(۴)

یہ جدوجہد کئی سال جاری رہی۔ جو کم حوصلہ تھے اُنہوں نے سمجھ لیا کہ بڑھیا بھاڑ نہ دیگی۔ مگر سیٹھ جانکی داس نے ہمت نہ ہاری۔ اُن کی دو دکانیں تھیں۔ اور یہ بھاڑ ان دونوں کے درمیان تھا۔ ارد گرد فانوس جلتے تھے۔ دربان

میں مٹی کا دیا ٹمٹماتا تھا۔ یہ دیا سہاگی کے لئے زندگی کا سہارا تھا۔ اسے دیکھ کر اُس کی رُوح پر مسرت کا نشہ چھا جاتا تھا مگر جانکی داس اُسے دیکھتے تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آتا سوچتے یہ جگہ مل جائے، تو دکان کی شان نکل آتے۔ ہزاروں جوان مرتے ہیں، اس بُڑھیا کو موت بھی نہیں آتی۔ مگر بڑھیا سے ملتے، تو نہایت مروت سے پیش آتے اور حلیمی سے بات چیت کرتے۔ سہاگی سمجھتی تھی کہ سیٹھ صاحب جیسا خیر خواہ آدمی ساری دلّی میں نہ ہوگا۔ تلوار پر مخمل کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ سہاگی درختوں کے روکھے سوکھے پتّے اور ٹوٹی پھوٹی ٹہنیاں چُننے گئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف سُورج کی کرنیں ناچتی تھیں۔ سہاگی نہایت آرام و اطمینان سے پتّے اکٹھے کر رہی تھی۔ کہ یکایک آسمان پر گھٹا چھا گئی۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سہاگی نے جمع کئے ہُوئے پتّے کپڑے میں باندھے اور شہر کی طرف روانہ ہُوئی۔ لیکن تین میل کا فاصلہ طے کرنا آسان نہ تھا۔ بارش نے بڑھیا کو آلیا۔ مینہ برسنے لگا۔ مگر یہ مینہ نہ تھا۔ سہاگی کی بدنصیبی تھی۔ ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی اور سوچنے لگی۔ شام کو کیا کرونگی۔ یہ پتّے بھی بھیگ گئے۔ تو بھاڑ کیسے گرم ہوگا۔ اور بھاڑ نہ گرم ہوا تو کھاؤں گی کیا۔ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر پرارتھنا کی کہ ذرا بارش تھم جائے، تو گھر پُہنچ جاؤں۔ مگر بادلوں نے سہاگی کی نہ سُنی۔ وہ آسمان کے رہنے والے تھے۔ اُنہیں زمین والوں سے کیا غرض تھی۔ جل تھل ایک ہوگیا۔ اُس دن کی بارش، بارش نہ تھی۔ قہرِ الٰہی تھا۔ آٹھ گھنٹے وہ پانی برسا کہ چاروں طرف شور مچ گیا۔ جمنا میں باڑھ آگئی۔ ہزاروں غریبوں کے مکان گر گئے۔ گائے بیل اس طرح بہے جاتے تھے جیسے گھاس پھوس کے تنکے ہوں۔ اُن کو بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اور یہ پانی باہر ہی تک محدود نہ تھا۔ شہر کے گلی کوچوں میں بھی لہراتا پھرتا تھا۔ جن کے مکان پکّے تھے وہ قدرت کے اِس تماشے پر ہنستے تھے۔ غریب لوگ روتے تھے اور پانی کہتا تھا، آج برس کے پھر نہ برسوں گا۔

بُڈّھی سہاگی ایک درخت پر بیٹھی چاروں طرف دیکھتی تھی۔ اور حسرت کے ٹھنڈے سانس بھرتی تھی۔ اُس کے ارد گرد پانی ہی پانی تھا۔ کوئی آدمی آدمزاد دُور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور اُس کے جمع کئے ہوتے پتّے کسی بدنصیب کے خوابوں کی طرح پانی میں منتشر ہو کر پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ کس مقام کو؟ مگر سہاگی کو اس کی پروا نہ تھی۔ اُس کے دل میں ایک ہی خواہش تھی۔ ایک ہی آرزو۔ کہ کسی طرح اپنے بھاڑ پر پُہنچ جاؤں۔ پتہ نہیں اُس کا کیا حال ہوگیا۔ پانی تلے غرق ہوچکا ہوگا۔ مٹی کا ایک تودہ رہ گیا ہوگا۔ اگر اُس کے بس کی بات ہوتی۔ تو وہ اُسی وقت

وہاں پہنچ جاتی۔ مگر پانی راستہ روکے کھڑا تھا۔ اُس وقت سبھاگی نے ایک فاختہ کو دیکھا۔ جو اُس درخت کی ایک ڈالی پر بیٹھی تھی اُس نے سوچا۔ کہ اگر مَیں فاختہ ہوتی تو اُڑ کر گھر چلی جاتی اور پانی میرا کیا بگاڑ لیتا۔ اتنے میں فاختہ نے پر کھولے۔ اور تھوڑی دیر میں نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ یہ دیکھ کر سبھاگی نے سوچا۔ پتہ نہیں یہ فاختہ کہاں گئی ہے۔ کس طرف، کس دیس کو؟ شاید میرے بھاڑ کی طرف ہی گئی ہو۔ اُس نے چاہا کہ مَیں بھی بھاگ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ مگر جھک کے نیچے دیکھا تو آدھا درخت ابھی تک پانی میں ڈوبا تھا اور سڑک دکھائی نہ دیتی تھی۔ سبھاگی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو گرم قطرے گرے۔ اور بارش کے سرد پانی میں حل ہو گئے۔

دوسرے دن سبھاگی درخت سے اُتری اور شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ پانی خشک ہو چکا تھا۔ مگر اُس کے نشان ابھی تک باقی تھے۔ سبھاگی کا بدن سردی سے اکڑا جاتا تھا۔ آنکھوں سے آگ سی نکلتی معلوم ہوتی تھی۔ پاؤں میں سکت نہ تھی۔ مگر وہ پھر بھی چل رہی تھی۔ جیسے شام کو چراگاہ سے گائے بچھڑے کی طرف بھاگتی ہے۔ وہاں لخت جگر کے پیار کی کشش ہوتی ہے۔ یہاں گھر کی کشش تھی مٹی میں بھی جادو ہے۔ مگر اسے دیکھنے کے لئے چشم حقیقت بین کی ضرورت ہے۔ خالی آنکھ سے وہ نظر نہیں آتا۔

سبھاگی چاندنی چوک میں پہنچی۔ تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ نہ وہ جھونپڑا باقی تھا نہ بھاڑ۔ اُن کے بجائے مٹی کا تودہ اور گھاس پھوس کا انبار پڑا تھا۔ سبھاگی کے دل پر چوٹ سی لگی۔ مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ شام کو لوگوں نے دیکھا۔ تو وہ جھونپڑا کھڑا کر رہی تھی۔ اور دوسرے دن بھاڑ بھی تیار ہو گیا۔ سبھاگی پھولی نہ سماتی تھی۔ اُس کے پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ اکڑ اکڑ کر چلتی تھی۔ اُس نے اپنا اُجڑا ہوا گھر بسا لیا تھا۔ جس میں اُس کا شوہر اُسے بیاہ کر لایا تھا۔

(۴)

بھاڑ بن گیا۔ مگر گرم ہونا اُس کی قسمت میں نہ تھا سبھاگی بیمار ہو گئی۔ بخار آنے لگا۔ سیٹھ جانکی داس نے کہا۔

"سبھاگی یہ تجھے کیا ہو گیا؟"

سبھاگی۔ "برکھا کی رات کی سردی کھا گئی۔"

جانکی داس۔ اور پھر دوسری رات بھی تو تو آرام سے بیٹھی جھونپڑا نہ تیار ہوتا تو کونسی تباہی آجاتی۔

سبھاگی نے حیران ہو کر سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور درد سے کراہ کر کہا۔ سر چھپانے کو جگہ بھی تو نہ تھی۔

جانکی داس۔ "تو میرے ہاں چلی آتی۔ تو کیا ہرج تھا۔ ہم تمہارے پڑوسی ہیں کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔"

سبھاگی۔ "یہ تو تم سے آشا ہی ہے۔"

جانکی داس۔ سبھاگی! تم بناوٹ سے کام لیتی ہو۔ میری مانو تو اب بھی میرے مکان میں اٹھ چلو۔ وہاں تمہاری ہر طرح سے خبرگیری ہوگی۔ کیوں کیا ارادہ ہے؟

سبھاگی کے دل میں پہلے تو خیال آیا۔ کہ چلی جاؤں میرے بڑھاپے میں چار دن آرام کے گزر جائینگے۔ مگر پھر جھونپڑے کی محبت نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ ساتھ ہی خاوند کے آخری لفظ یاد آ گئے۔ آہ سرد بھر کر بولی۔ "سیٹھ جی اس جھونپڑے سے مَیں نہ نکلوں گی۔ میرا جنازہ نکلے گا۔"

جانکی داس۔ "اچھا تو یہ کہو مرنے کی ٹھانی ہے۔

سبھاگی۔ اگر موت ہی بھاگ میں لکھی ہے تو اُسے کون روک سکتا ہے۔ پر یہ جھونپڑا تو نہ چھٹے گا۔

جانکی داس نے چند منٹ تک سکوت کیا۔ اور اس کے بعد یکایک اُن کے دل میں کوئی خوشگوار خیال آ گیا جیسے بعض وقت تاریکی یاس میں شعاع امید نظر آجاتی ہے آہستہ سے بولے۔ بہت بہتر! مگر مجھے اتنی اجازت دو کہ تمہارے دوا دارو اور کھانے پینے کا انتظام کر دوں نہیں مجھے تم سے ہمیشہ کے لئے گلہ رہیگا۔"

سبھاگی سادہ لوح عورت تھی۔ اُس نے نئے زمانہ کے چھل نہ دیکھے تھے۔ وہ اس عہد کی عورت تھی۔ جب زبان دل کی ترجمانی کرتی تھی۔ سیٹھ صاحب کی شیریں بیانیوں نے اُس کا دل موہ لیا۔ اُس نے سطح آب پر کھلے ہوئے کنول کے پھول دیکھے۔ مگر اُن کے نیچے جو ناگ تھا اُس کی طرف اُس کا دھیان نہ گیا۔ اُس نے جذبہ شکر گزاری سے تھرتھراتی ہوئی آواز سے کہا۔ "نارائن تمہارا بھلا کرے۔ مَیں اس کا بدلہ نہ دے سکونگی۔"

سیٹھ جانکی داس نے ایسی جانکاہی اور کوشش سے علاج کیا کہ کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ کرتا ہوگا۔ رات کو دو دو مرتبہ اُٹھ کر پرسش حال کے لئے آتے۔ اور روپیہ پیسہ تو پانی کی طرح بہا دیا۔ اُنہیں اس کی پروا نہ تھی۔ اُن کا خیال تھا، بڑھیا کسی طرح صحتیاب ہو جائے، تو بھاڑ کی جگہ ملنا چنداں دشوار نہ ہوگا۔ اور ہوا بھی یہی۔ چھ ماہ کے بعد سبھاگی تندرست ہوئی تو اُس کا بال بال سیٹھ صاحب کا مقروض تھا اُن کا روپیہ اُس کے جھونپڑے کو نہ خرید سکتا تھا! احسان نے خود اُسے بھی خرید لیا۔ اب سبھاگی پہلی سبھاگی نہ تھی۔ کبھی وہ سیٹھ جانکی داس کے آگے سے اکڑ کر نکل جاتی تھی۔ مگر آج اُن کے سامنے اُس کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں۔ کیونکہ اب اُن میں مروّت آ بیٹھی تھی۔ جس کام کو سختی نہ کر سکی تھی۔ اُسے نرمی نے کر دیا۔ سبھاگی سیٹھ جانکی داس کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور رونے لگی۔ لیکن سیٹھ صاحب نے اُسے اس طرح عزت سے اُٹھا لیا۔ گویا وہ اُن کی اپنی ماں تھی۔

چند دن کے بعد چاندنی چوک کے تاجروں نے حیرت کے ساتھ سُنا۔ کہ سبھاگی نے اپنا جھونپڑا سیٹھ جانکی داس

کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ یہ خبر معمولی نہ تھی۔ لوگ فرطِ تعجب سے چونک پڑے۔ اُن کو اس خبر پر یقین نہ آتا تھا۔ متانت سے سر ہلا کر کہتے تھے۔ یہ بھی سیٹھ صاحب کی چال ہے۔ بڑھیا جیتے جی جھونپڑا نہ چھوڑیگی۔ بعضے کہتے تھے سیٹھ صاحب نے سبھاگی تھی، میوہ پالیا۔ بعض کہتے تھے، یہ خبر سرے سے ہے ہی غلط۔ لیکن جب جھونپڑا اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ اور کھدائی کا کام شروع ہوگیا، تو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ سیٹھ صاحب بازی لے گئے۔

(۵)

سبھاگی سادہ لوح ضرور تھی۔ لیکن بیوقوف نہ تھی سیٹھ جانکی داس کی سرگرمیوں کے معنے سمجھنے میں اُسے دیر نہ لگی۔ اُس نے ساری عمر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا تھا۔ نہ کسی کا بارِ احسان اُٹھایا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کمائی کھانے کی خوگر تھی۔ اُس نے آجتک کسی کے سامنے آنکھیں نہ جھکائی تھیں۔ خود غریب تھی لیکن اُس کی آن امیروں سے بڑھ کر تھی۔ اس بیماری نے اُس کا یہ اثاثہ لُٹا دیا۔ اُس کی جان بچ گئی، مگر غیرت جاتی رہی سبھاگی اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہُوئی۔ اب چاندنی چوک میں وہ متانت کی چال چلنا اُس کے لئے دشوار ہوگیا۔ اُس کا دل کہتا تھا۔ اس داغ سیاہ نے کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رکھا۔ کندھے احسان کے بار تلے دبے جاتے تھے۔ چند دن تذبذب میں گزرے۔ لیکن ہر شام کو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اُس کے دل کا اندھیرا۔ سینہ کا بار زیادہ ہوگیا ہے۔ جیسے مقروض کا قرض روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ذہنی اذیت برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہوگیا۔ ایک دن سیٹھ صاحب کے سامنے جا کر بولی۔ سیٹھ صاحب تم نے مجھ پر بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا بال بال تمہیں آشیرباد دے رہا ہے۔ مجھ میں یہ قرض اُتارنے کی ہمّت نہیں۔ ایک غریب مجورنی کیا کرسکے گی۔ پر پھر بھی مجھے معلوم تو ہو۔ کہ میری بیماری پر کتنا خرچ ہوگیا۔"

سیٹھ صاحب کا کلیجہ دھڑکنے لگا جس وقت کا انتظار تھا وہ آپہنچا تھا۔ اُنہوں نے بہی کھولکر حساب کیا۔ اور اپنے دل کی دھڑکن کو دبا کر کہا۔

"ساڑھے چار سو"

"ساڑھے چار سو؟" سبھاگی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے ساری دُنیا گھوم رہی ہے۔ چند لحہ تک وہ چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی۔ اور اِس کے بعد آہ سرد بھر کر بولی۔" یہ قرض کیسے اُترے گا؟"

جب ہمیں کوئی سخت بات کہنا ہوتا ہے تو ہم زبان کے حلیم بن جاتے ہیں۔ سیٹھ صاحب نے بھی

نہایت شیریں لہجہ میں جواب دیا "جھونپڑا بیچ دو۔ قرض اُتر جائیگا"

سبھاگی کی آنکھوں میں مروت تھی۔ یہ سنگدلانہ تجویز سُن کر وہاں نہ ٹھہر سکی۔ اُس کے جانے پر خالی جگہ دیکھ کر غُصّہ نے اپنا عمل دخل بٹھا لیا۔ جیسے خالی مکان میں بھُوت آ بستے ہیں۔ سبھاگی نے شرربار نگاہوں سے سیٹھ صاحب کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "زبان سنبھال کے بول جھونپڑے کی طرف نگاہ بھی اُٹھائی، تو آنکھیں نکال لونگی۔"

سیٹھ صاحب ہنسے، اس ہنسی میں بے رحمی و سفاکی کے وہ عنصر شامل تھے جو قصابوں کے دلوں میں بھی نہ ہونگے۔ گویا سیٹھ صاحب نے زبانِ حال سے کہا "جو کچھ کہنا ہے کہہ لو۔ پر اب تمہارا جھونپڑا تو گیا۔"

تھوڑی دیر بعد بولے۔ "تو سبھاگی! میرا روپیہ لوٹا دو۔ میں تمہارا جھونپڑا نہیں لینا چاہتا۔"

سبھاگی نے غرور سے گردن بلند کی۔ جیسے کسی نے ناگن کو چھیڑ دیا ہو۔ اور غُصّہ سے پھنکارتے مارتی ہوئی بولی۔ "اگر کسی بھڑبھونجے کی بیٹی ہوں تو تمہاری کوڑی کوڑی ادا کر دونگی۔ پر یہ جھونپڑا تمہارے ہاتھ نہ بیچوں گی۔"

جانکی داس۔ "بہت اچھا۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ کون تمہیں تھیلیاں کھول دیتا ہے۔"

سبھاگی۔ "میرا بھگوان مر تو نہیں گیا۔"

جانکی داس۔ "بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگر تمہارا جھونپڑا بچ جائے، تو مجھے کچھ کم خوشی نہ ہوگی۔ مجھے تو اپنا روپیہ چاہیئے۔"

سبھاگی۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہارے دل میں کپٹ بھرا ہے۔"

جانکی داس۔ "کلجگ کا زمانہ ہے۔ اب نیکی کرنا بھی پاپ ہو گیا"

سبھاگی۔ "پر تم سے نیکی کرنے کو کہا کس نے تھا؟"

جانکی داس۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آیندہ کبھی ایسا نہ ہوگا ایکبے بخش دو۔"

سبھاگی۔ "میں سمجھی تھی تُو نیک آدمی ہے۔ پر آج آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔"

جانکی داس۔ "چلو یہی غنیمت ہے۔"

سبھاگی۔ "پر تمہیں جھونپڑا نہ ملے گا۔ سوچتے ہوگے دونوں دُکانیں ملا کر محل بنا لونگا۔ اس سے مُنہ دھو رکھو۔

اب جانکی داس کو بھی غُصّہ آ گیا۔ ذرا ترش ہو کر بولے۔ "دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے روک جاتا ہے ایک ماہ کے اندر اندر اس جھونپڑے کا نام و نشان تک باقی نہ رہیگا۔"

غریب کی زبان بہت چلتی ہے۔ سبھاگی نے جو کچھ جی میں آیا کہا۔ اور اپنے جھونپڑے میں جا کر رونے لگی کبھی اپنے بھاڑ کو دیکھتی کبھی جھونپڑے کی کچی دیوار کو، اور زار زار روتی۔ جیسے لڑکی سسرال کو جاتے وقت ماں باپ سے ملکر

روتی ہے۔ اُس وقت اُس کے دل میں کتنا رنج ہوتا ہے۔ سینہ پر کیسا بار۔ اُسے دُنیا کی کوئی چیز بھی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ یہی حالت سبھاگی کی تھی۔ اپنے جھونپڑے کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر اُس کے دل میں بھالے چبھ رہے تھے۔ اسی طرح تین چار دن گذر گئے۔

چوتھے دن ایک آدمی شمبھوناتھ نے آکر کہا۔ سبھاگی! اب تیری طبیعت کیسی ہے؟

سبھاگی۔ "بھگوان کا شکر ہے۔"

شمبھوناتھ۔ "سُنا ہے سیٹھ جانکی داس نے تیرے لئے بہت خرچ کیا ہے۔

سبھاگی۔ "بھیّا! اُس پاپی کا میرے سامنے نام نہ لو۔"

شمبھوناتھ۔ "شہر میں تو بڑا جس ہو رہا ہے۔ کہتے ہیں اُس نے سبھاگی کو بچا لیا ہے۔ آدمی کا ہے کو ہے دیوتا ہے۔"

سبھاگی۔ "میرا بس چلے تو مُنہ جھلس دُوں۔"

شمبھوناتھ۔ "اصلی بات کیا ہے؟"

سبھاگی۔ "ایسا کمینہ آدمی ساری دِلّی میں نہ ہوگا۔ چار پیسے خرچ کر کے کہتا ہے۔ ساڑھے چار سو اُٹھ گئے۔ مَیں نے سوچا ساری عمر خدمت کرتی رہونگی۔ پر اس کی آنکھیں تو اس جھونپڑے پر ہیں۔ اب کہتا ہے یا روپیہ واپس کر دو یا جھونپڑا بیچ دو۔ کیسا اندھیر ہے۔

شمبھوناتھ۔ "یہ سب کلجگ کا اثر ہے۔"

سبھاگی۔ "پر بھیّا۔ تم سے سچ کہتی ہوں۔ یہ جھونپڑا اُسے تو نہ دُونگی۔"

شمبھوناتھ نے ذرا ہمدردانہ لہجہ میں پُوچھا۔ "مگر کیا کرو گی۔ نالش کر دیگا۔"

سبھاگی لاجواب ہو گئی۔ اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جو بیکسوں کا آخری سہارا ہے۔ یکایک اُس نے سر اُٹھایا۔ اور رازداری کے لہجہ میں آہستہ سے بولی۔ تم ہی نہ خرید لو۔ مَیں تمہارے ہاتھ آج ہی بیچ دیتی ہوں۔"

شمبھوناتھ۔ "سبھاگی! تم نے خوب سوچا۔"

سبھاگی۔ "دانت کھٹے ہو جائینگے۔ مُنہ دیکھتا رہ جائیگا۔"

اس کے بعد خرید و فروخت کی بات چیت ہونے لگی۔ بہار مرلے زمین تھی۔ دو سو روپیہ مرلہ پر معاملہ طے ہو گیا۔"

سبھاگی کے سینہ سے بوجھ ہٹ گیا۔ مگر پھر طبیعت پر افسردگی طاری ہو گئی۔ جیسے کوئی بیوپاری اپنے سودے میں کامیاب ہو کر پھر کسی فکر میں محو ہو جاتا ہے۔ اور اس فکر میں اُس کی خوشی جگنو کی چمک کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ رات انہی تفکرات میں گزر گئی۔ دوسرے دن وہ کچہری میں تھی۔ اور کچہری کا آدمی اُس سے کہہ رہا تھا "بڑھیا! یہاں انگوٹھا لگا دے۔"

(۶)

سبھاگی نے یہ لفظ سُنے۔ مگر جھجک ایسے، جیسے کوئی

خواب میں دُور کی آواز سُنتا ہے۔ اور اُس کا مطلب کچھ سمجھتا ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ اُس نے بے خبری کے عالم میں انگوٹھا آگے کر دیا۔ عدالت کے آدمی نے اُس پر سیاہی لگا دی۔ اور اُسے پکڑ کر اُس کا نشان کاغذ پر لگا دیا۔ اُس کو کیا معلوم تھا۔ کہ یہ سیاہی میں نے کاغذ پر نہیں پھیری۔ اپنے مستقبل کی خوشی پر پھیر دی ہے۔ اتنے میں شمبھو ناتھ نے آٹھ سو روپے گن کر اُس کی جھولی میں ڈال دیئے۔ سبھاگی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ مگر یہ روشنی چراغ کی لو تھی۔ جو بجھنے سے پہلے ایک دفعہ ہنستی ہے۔ اور اس کے بعد اتھاہ تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ عدالت سے باہر آکر سبھاگی کو صورت حال کا صحیح احساس ہُوا۔ اتنے روپے اگر اُسے پہلے مل جاتے، تو اپنے جھونپڑے میں جاکر شاید سو دفعہ گنتی۔ اور پھر زمین میں دبا دیتی۔ لیکن اب کہاں جائے۔ اُس نے بہت سوچا چاروں طرف دیکھا۔ لیکن کوئی مامن نظر نہ آیا۔ وسیع گنجان آباد دُنیا میں وہ تنہا بیکس تھی۔ اُس کا کوئی اپنا نہ تھا۔ اُس کے پاس روپے تھے لیکن روپے رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ اُس کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اندھی بہری دُنیا کے طوفان میں کون اُس کا ہاتھ تھامے گا۔ کس چھت تلے جاکر پناہ لیگی۔ ایک جھونپڑا تھا برسوں کا مونس و غمخوار۔ اُس میں نصف جوانی اور نصف بڑھاپے کے دن گزارے تھے۔ غریب بچے بیکس عورتیں سب آکر اُس سے اناج بھنواتے تھے۔ یہ اس کے رشتہ دار تھے۔ آج سب بچھڑ گئے۔ آج اُس کے گھر کے دروازے اُس پر بند ہو گئے۔ بیچاری کہاں جائے۔ کس طرف۔ کدھر؟ لوگ کچہری سے نکلتے، تو تیزی سے شہر کی طرف چلے جاتے اُن کے گھر ہونگے۔ مگر سبھاگی کا گھر کہاں ہے؟ اُس کے پاس محل نہ تھا۔ عالیشان مکان نہ تھا۔ ایک پھوس کا جھونپڑا اور کچّا بھاڑ۔ ظالموں نے وہ بھی چھین لیا۔ سبھاگی رونے لگی۔ اُس کے دلخراش نالوں نے راہگیروں کے دِل ہلا دیئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

شام کا وقت تھا۔ سبھاگی سیٹھ جانکی داس کی دُکان پر پہنچی۔ اور ڈرتے ڈرتے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ جیسے کوئی گداگر ہو۔ اب اس میں وہ حوصلہ وہ جُرأت نہ تھی جس کی ساری دِلّی میں دھاک بندھی ہُوئی تھی۔ جب وہ گھر والی تھی۔ اب بے گھر۔ جس کا دُنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ سیٹھ جانکی داس نے اُسے دیکھا تو آنکھوں میں پانی آگیا۔ غرور کے لاکھوں دُشمن ہیں۔ بے بسی کا ایک بھی نہیں۔ اب اُنہیں کس پر غصّہ آتا؟ ایک بھٹیارن پر؟ وہ ایسے اوچھے، اس قدر ذلیل نہ تھے۔ اُٹھ کر باہر آگئے اور بولے "سبھاگی!

سبھاگی نے روپے زمین پر اُلٹ دیئے۔ اور کہا۔ یہ تمہارے روپے ہیں۔ انہیں سنبھال لو۔ یہ تم کو مبارک ہوں۔ تم نے ساڑھے چار سو کہا تھا۔ یہ آٹھ سو ہیں۔ میرا جھونپڑا میرے ہاتھ سے گیا۔ پر تمہارے کلیجہ میں تو ٹھنڈ

پڑ گئی۔"

سبھاگی کے لفظ نہیں تھے زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔ سیٹھ صاحب بیتاب ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے کہ سبھاگی کے پاؤں میں گر کر معافی مانگیں۔ انہیں اب معلوم ہوا کہ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ اس غریب بڑھی کے دل میں گھر کا ایسا پیار ہو گا۔ یہ انہیں آج معلوم ہوا۔ مگر سبھاگی وہاں نہ تھی۔ البتہ اس کے روپے زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ یہ روپے نہ تھے سبھاگی کی حسرتیں تھیں۔ خون سے شور بور۔

آدھی رات کو سبھاگی اپنے جھونپڑے میں داخل ہوئی، مگر اس طرح خاموشی سے جیسے کوئی چور ہو۔ پھونک پھونک کر پاؤں دھرتی تھی۔ کوئی سُن نہ لے۔ کوئی دیکھ نہ لے کبھی وہ اس جھونپڑے کی رانی تھی۔ آج پردیسن جسکا اس پر کوئی حق نہ تھا۔ اس نے چراغ جلایا۔ سب کچھ وہیں پڑا تھا۔ ایک پیتل کی تھالی ایک لوٹا۔ دو کٹوریاں، ایک چارپائی بس یہی اُس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ آج وہ اُن سے وداع ہونے آئی ہے۔ وہ نئے زمانہ کی عورتوں میں سے نہ تھی، جو اپنے مکان کو چھوڑتے وقت ایک قطرہ اشک بھی نہیں بہاتیں، نہ اُن کے دل پر اس حسرتناک موقعہ پر کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ وہ پرانے زمانہ کی ناتعلیم یافتہ جاہل عورت تھی۔ جس کے لئے گھر چھوڑنا اور دنیا کو چھوڑنا دونوں برابر تھے۔ وہ اپنی چیزوں کو لپٹ لپٹ کر روئی۔ گویا وہ بے جان اشیاء نہ تھیں جیتی جاگتی سکھیاں تھیں۔ جن کی جُدائی کا خیال اُس کا خون سرد کئے دیتا تھا۔ اس وقت اُس کا دل رو رہا تھا۔ صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا سب کچھ وہیں پڑا ہے۔ اُسی طرح۔ صرف سبھاگی نہ تھی۔ مکان موجود تھا۔ لیکن کا پتہ نہ تھا۔ سیٹھ جانکی داس کی چال کامیاب ہو گئی۔ وہ جگہ شمبھو ناتھ سے اُنہوں نے خرید لی۔ یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا۔ سبھاگی سیٹھ صاحب کے ہاتھ یہ جگہ دوہزار کو بھی نہ بیچتی۔ اُنہوں نے سبھاگی کی بہت تلاش کرائی لیکن کچھ سراغ نہ ملا۔

مگر سبھاگی کہاں تھی؟ شہر سے باہر جمنا کے کنارے جنگل میں۔ وہ اُسی رات بھاگ گئی۔ اب اُسے شہر سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی ایسی جگہ جا رہے۔ جہاں کوئی واقفکار شناسا نظر نہ آئے۔ وہ آدمی کے سایہ سے بھاگتی تھی۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اب اُس کے کان انسانی آواز کے بھوکے نہ تھے۔ نہ اُس کے لئے دُنیا میں امید کا دلنواز نغمہ باقی رہا تھا۔ بھوکی پیاسی دیوانہ وار چلی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں کہاں؟ شاید وہاں جہاں انسانی ہمدردی کی صدائے شیریں اور امید کا خیال موہوم بھی نہ ہو۔ وہ اب ایسی جگہ چاہتی تھی۔ جہاں کوئی خوشی کوئی مسرت، کوئی چمک نہ ہو۔ رات کے اندھیرے میں سبھاگی پتھروں سے ٹکراتی جھاڑیوں سے اُلجھتی، گڑھوں میں گرتی

پڑتی، اس طرح چلی جاتی تھی جس طرح اُڑتے ہُوئے پنچھی کا سایہ چلا جاتا ہے۔ اور اُسے روکنے کی کسی میں طاقت نہیں ہوتی۔ وہ آدمی اور آدمی کے خیال دونوں سے دُور بھاگ رہی تھی۔ جنگل کے خونخوار درندے اُسے آدمی سے کہیں رحمدل اور مروّت پسند معلوم ہوتے تھے۔ سوچتی تھی۔ یہ جھوٹ نہیں بولتے۔ دھوکا نہیں دیتے۔ بغل میں چھُری رکھ کر مُنہ سے میٹھی میٹھی باتیں نہیں بناتے۔ انہیں خوشامد کرنا نہیں آتا۔ یہ انسان سے ہزار درجہ اچھے ہیں۔

اسی طرح سبھاگی جنگل اور اپنی قسمت کے اندھیرے میں بڑھتی چلی جاتی تھی۔ کہ بھُوک پیاس اور سردی نے اس کی طاقتوں پر غلبہ پالیا۔ اور اُس کے پاؤں رُک گئے۔ اور وہ کسی بدنصیب کے نصیب کی طرح اندھیرے میں جنگل کی زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی تھی۔ گیدڑوں کی مہیب آوازیں رات کو اور بھی خوفناک بنائے دیتی تھیں اور سبھاگی اپنے جھونپڑے کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ مگر اس کے آنسوؤں کو دیکھنے والا سوائے آسمان کے تاروں کے اور کوئی نہ تھا۔

یہاں سبھاگی نے پندرہ دن کاٹے۔ درختوں کے پھل کھاتی جمنا کا پانی پیتی اور رنج و غم کے گیت گاتی یہاں تک کہ اُس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ اور وہ پھر اپنے پُرانے شہر کو واپس ہوئی۔ لیکن شہر کے قریب آکر اُس کا دل بیٹھ گیا۔ "کہاں جاؤں؟ کیسے جاؤں؟ اب میرا اس شہر میں کیا کام ہے۔ لوگ دیکھینگے تو کیا کہیں گے۔" آخر ارادہ کیا کہ رات میں جاؤں گی۔ کوئی دیکھنے نہ پائے مگر رات بہت دیر میں آئی۔ بدنصیبوں سے وقت کو بھی دُشمنی ہے۔

سبھاگی اپنے جھونپڑے کے پاس پہُنچی۔ تو اس پر بجلی سی گر پڑی۔ وہاں جھونپڑا نہ تھا۔ نہ اُس کا بھاڑ نظر آتا تھا۔ زمین کھُدی ہُوئی تھی چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ سبھاگی نے ایک نعرہ مارا۔ اور زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہُوا، جیسے چاندنی چوک کی تمام روشنیاں بُجھ گئی ہیں۔ اور آسمان کے تاروں نے اندھیرے کی چادر میں مُنہ چھپا لیا ہے یکایک اُسے خیال آیا "میرا خاوند مجھے لینے آئے گا تو کیا کہیگا۔ کہاں ڈھونڈیگا۔"

صبح کے وقت وہاں اُس کی لاش پڑی تھی۔ اُسکا بچن جھوٹا نہ نکلا۔ اُس نے دُنیا چھوڑ دی۔ مگر اپنا جھونپڑا نہ چھوڑا۔ نئی دلّی میں پُرانی دلّی کا ایک ہی چراغ روشن تھا وہ بھی بُجھ گیا سیٹھ جانکی داس کئی دن گھر سے باہر نہ نکلے۔

سُدرشن

نُور جہاںؔ کا مزارؔ

(ذیل کی دو نظمیں انجمن ارباب علم کے جلسہ منعقدہ شملہ میں پڑھی گئی تھیں)

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہ نور جہاں ہے
مُدّت ہوئی وہ شمع نہ خاک نہاں ہے اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دُھواں ہے
جلووں سے عیاں جس کے ہُوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اس کی شب دیجور کا عالم

اے حُسنِ جہاں سوز، کہاں ہیں وہ شرارے کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟ ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشق دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے غالیچہ سر فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو۔ مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر یہ دور زمانہ کے اُلٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر اے گردش ایّام، یہ اندھیر یہ اندھیر
ماہِ فلکِ حُسن کو یہ بُرج ملا ہے
اے چرخ زنسری! ہیچ نوازی کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی، یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارا

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضہ میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے تیتر اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے

پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوب دلِ خلق تھے جاں بخش جہاں تھے تھے یوسفِ ثانی کہ مسیحائے زماں تھے

جو کچھ تھے کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اِک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

محروم

شملہ

رشک فردوس ہے محرّم ! فضا شملے کی
نفسِ حور سے بڑھ کر ہے ہوا شملے کی

چہرۂ شاہدِ فطرت نہیں مستور یہاں
نہیں اے ذوقِ نظر! پردے کا دستور یہاں

راجہ اندر کا اکھاڑا ہے یہ کہسار نہیں
سبز پریوں کے ہیں انبوہ۔ یہ اشجار نہیں

اس کی رفعت کا بھلا کس سے ہو اندازہ ٹھیک
ہونگی جنّت کی فضائیں کہیں اس کے نزدیک

نگہِ شوق جدھر اُٹھ کے چلی جاتی ہے
مخملی فرش بچھا زیرِ قدم پاتی ہے

کیا خبر کیسا ہو نیرنگ تماشائے بہار
کہ خزاں میں ہے یہاں منظرِ زیبائے بہار

چشمِ مشتاق کو سامانِ تماشا ہیں بہم
شجر و سبزہ و گل انجمن آرا ہیں بہم

بے تکلف ہے یہاں عشوۂ عریانِ بہار
خلوتِ ناز ہے یہ بزمِ عروسانِ بہار

حیرت افزا ہیں بہت چیل کے اشجارِ بلند
ان کی توصیف کو درکار ہیں افکارِ بلند

کوئی دیکھے تو ذرا ان کی فلک فرسائی
بے ستوں کب ہے یہ سقفِ فلکِ مینائی

تازگی جلوۂ انوارِ سحر میں ہے یہاں
طفلِ معصوم اُٹھے نیند سے جیسے خنداں

منظرِ شام نیا لطف دکھا دیتا ہے
سایۂ زلفِ حسیناں کا پتا دیتا ہے

قمقمے دامنِ کہسار سے تا دامنِ چرخ
جن کی طلعت سے ہے ممنونِ ضیا دامنِ چرخ

نظر آتے ہیں ستاروں سے زیادہ روشن
روبرو ان کے ستارے ہیں دِیے بے روغن

سامنے ان کے نہ کیوں ماند ہوں سارے تارے
ٹکڑے بجلی کے ہیں یہ اور وہ بچارے تارے

جس طرف دیکھئے اِک نور نظر آتا ہے
جو شجر ہے شجرِ طور نظر آتا ہے

سبق آموز ہے کیا خوب یہاں کی بستی
ہر بلندی کی بغل میں ہے برابر پستی

دُھوپ چھاؤں کے مناظر بھی غضب ڈھاتے ہیں
رنگ نیرنگیٔ دوراں کا دکھا جاتے ہیں

سایۂ ابر کہیں۔ جلوۂ خورشید کہیں
عالمِ یاس کہیں، پر تو امید کہیں

سایہ و نور کا باہم یہ بدل کر چلنا
یاس و امید کے جادو کا ہے یکسر چلنا

پھر کبھی شملے کی تعریف میں لکھیں گے کچھ اور
اب تو بدلا ہے خیالات نے پہلو بے طور!

تلوک چند محروم

غزل

مُفت اُس بیداد گر کا ہم پہ احساں ہو گیا
نالۂ جانکاہ خود ہی آفتِ جاں ہو گیا

ہے دلِ روشن تو کیا دشوار ہے منزل رسی
راہبر ہر ذرّۂ ریگِ بیاباں ہو گیا

حالِ دل سُن کر وہ اس انداز سے ہنسنے لگے
بے حقیقت خندۂ چاکِ گریباں ہو گیا

دیکھئے کیا آج ہوتا ہے مآلِ انتظار
جان کا آزار طولِ شامِ ہجراں ہو گیا

دیکھنا حیرت فروشی حسنِ جاناں کی کہ مَیں
دیکھتے ہی صورتِ آئینہ حیراں ہو گیا

لیکے ہم جائینگے کیا تحفہ پئے حورانِ خلد
ایک دل پہلو میں تھا وہ نذرِ خوباں ہو گیا

کس کے جلووں سے ہُوا روشن چراغِ آرزو
کون بزمِ ناز میں شمعِ شبستاں ہو گیا

عشق کب رکھتا ہے باقی ظاہر و باطن میں فرق
بڑھتے بڑھتے چاکِ دل چاکِ گریباں ہو گیا

مدعائے دل بیاں کرنے گئے تھے ہم مگر
مانعِ گفتار رعبِ حسنِ جاناں ہو گیا

منحصر تم ہی پہ حیرانی نہ تھی کچھ اے کلیم
ذرّہ ذرّہ وادیٔ ایمن کا حیراں ہو گیا

پُورن سنگھ ہنر

میری داستانِ حیات

(گزشتہ سے پیوستہ)

اعلیٰ شاعری خواہ یونانی میں ہو، خواہ انگریزی زبان میں ہو۔ اپنی شرح کے لئے ایک جواب وہ رُوح سے بڑھ کر اور کسی کی محتاج نہیں ہُوا کرتی، کاش کہ شرح کنندگان کا وہ لشکر جو شعراء کے اعلےٰ کلام کا حلیہ اپنی تخلیل، فرمائش اور طولانی حاشیوں کے ذریعے بگاڑ کر اسے مکروہ ' اور ملیا میٹ کئے دیتا ہے۔ اس سادہ حقیقت کو ذہن نشین کرے! یہ ضروری نہیں کہ کسی نفیس نظم کی خوبی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے ہر لفظ کی تشریح کی جائے، یا اس کے الفاظ کی نحوی ترکیب کیجائے۔ میں جانتی ہوں کہ میرے عالم اساتذہ نے میری بہ نسبت نظم الییڈ کے بہت زیادہ رُوح پرور خزانے دریافت کئے ہونگے میں اتنی حریص نہیں ہوں۔ میں اسی پر قانع ہوں کہ دوسرے لوگ مجھ سے بڑھ کر عالم اور دانا ہیں۔ لیکن باوجود اپنے تمام وسیع علم کے وہ میری طرح اس شاندار رزمیہ نظم کے لطف کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں۔ جب میں نے اس نظم کے بہترین حصے پڑھے تو مجھے ایک روحانی قوت پیدا ہونے کا احساس ہُوا۔ جس نے مجھے زندگی کے تنگ و تار حالات سے اُٹھا کر بلند کر دیا تھا۔ مجھے اپنے جسمانی نقائص بھول گئے تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ میری دُنیا اس سے کہیں بالاتر ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں اور آسمانوں کا طول و عرض اور ان کی تمام وسعت میری وسعت ہے! میں اینیڈ کی اتنی دلدادہ نہیں، تاہم اس کی وقعت میرے نزدیک کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے حتی الامکان شرح اور لغت کی مدد کے بغیر جتنا ہو سکا اس کا مطالعہ کیا۔ اور میں نے ہمیشہ ان کے ان واقعات کا جو مجھے مرغوب ہیں۔ ترجمہ کیا ہے۔ رومہ کا شاعر ورجل جس نے یہ رزمیہ نظم لکھی ہے بعض اوقات بلا کے نادر مناظر پیش کرتا ہے۔ اس کے پیش کردہ دیوتا، اور انسان، کشمکش، رحم اور محبت کی کیفیات میں سے گزرتے ہیں۔ جس طرح ملکہ الزبتھ کے عہد میں ناٹکوں کی خوشنما پتلیاں سٹیج پر تماشا کرتی نظر آتی ہیں۔ حالانکہ الییڈ میں ہی ایکٹر صرف دو تین ذقندیں بھر کر گانے بجانے میں مصروف

ہوجاتے ہیں۔ ورجل کا طرزِ کلام بعینہٖ ایسا متین اور پُرلطف
ہے۔ جیسے شبِ ماہتاب میں اپالو[۵۱] کا نظارہ۔ برخلاف
اس کے ہومر کی تصویر کشی کی یہ صورت ہے۔ گویا وہ خوبصورت
جوشیلا نوجوان ہے۔ کہ سورج کی کامل روشنی میں کھڑا ہے
اور اس کے سر کے بال ہوا سے اس کے رخساروں پر
ہلتے نظر آتے ہیں۔ کاغذ کے پر لگا کر اُڑنا کتنا آسان ہے!
میرے لئے "یونانی شجاعوں" کی سیر سے فارغ ہوکر
الیڈ کی فضا کی طرف عبور کرنا ایک دن کا بھی سفر نہ تھا
اور نہ یہ سفر چنداں پُرلطف تھا۔ مَیں جتنا عرصہ گرامر اور
لغات کی پیچیدگیوں میں اُلجھی رہتی تھی۔ یا امتحان کے ان
خطرناک گڑھوں میں گری پڑتی تھی جو سکول اور کالجوں
کے کارپرداز، مشتاقانِ علم کے لئے کھودتے تھے۔ اتنے
عرصے میں تو انسان دُنیا کے گرد کئی مرتبہ سفر کرسکتا ہے
میرا خیال ہے کہ اس قسم کا "حاجی کا سفر" بلحاظ اس کے
انجام کے راستی پر مبنی تھا۔ لیکن مجھے کم از کم یہ لامحدود تو
ضرور ہی معلوم ہوتا تھا۔ باوجودیکہ مجھے اثنائے مطالعہ
میں بہت سے دلخوش کن اور حیران کرنے والے واقعات

[۵۱] مشہور یونانی دیوتا جو فنون طب، موسیقی، شاعری اور فصیح البیانی کا سرپرست کہلاتا ہے۔ یونانی علم الاوثان میں اس کا ذکر بکثرت آتا ہے۔ (مترجم)

پیش آتے رہے۔ بہت عرصہ پیشتر اس کے کہ مَیں انجیل
کو سمجھ سکتی۔ مَیں نے اس کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔
مجھے یہ امر نہایت تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ کیا مجھ پر
کبھی ایسا زمانہ گزرا ہوگا۔ جبکہ میری رُوح انجیل کی نادر
نغمہ آفرینیوں کی طرف سے بہری رہی ہو؟ مجھے بخوبی یاد
ہے۔ کہ جب اتوار کو اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ تو میں اپنی
ایک عزیز رشتہ دار سے یہ کہتی تھی کہ مجھے انجیل میں سے
کوئی کہانی پڑھ کر سُناؤ! اگرچہ اس عزیز کو یہ خیال نہیں
ہوتا تھا۔ کہ مَیں اسے سمجھ سکوں۔ تاہم وہ میرے کہنے
سے یوسفؑ اور اُن کے بھائیوں کا قصّہ میرے ہاتھ پر ہجّا
کرکے بتاتی تھی۔ کسی نامعلوم وجہ سے وہ مجھے بے لطف
معلوم ہونے لگتا تھا۔ ناشناسی زبان اور اس میں بعض
امور کے تکرار سے مجھے یہ قصّہ اصلی معلوم نہیں ہوتا تھا۔
کنعان کی سرزمین بھی بے حدود دراز تھی۔ پس مجھ پر غنودگی
طاری ہوجاتی تھی۔ اور پیشتر اس کے کہ یوسفؑ کے بھائی
ان کا خون آلودہ کُرتا لیکر یعقوبؑ کے خیمے میں داخل ہوں
اور اپنی جھوٹ موٹ کی بناوٹی کہانی ان سے بیان کریں
مَیں کسی اور ہی مُلک کی سیر میں محو ہوتی تھی۔ مَیں نہیں سمجھ
سکتی کہ مجھے یونانی قصّے کیوں اتنے دلفریب معلوم ہوتے
تھے۔ اور انجیلی قصص کیوں میرے لئے دلچسپی سے خالی
تھے۔ شاید اس کا یہ سبب ہو کہ بوسٹن میں مجھے چند

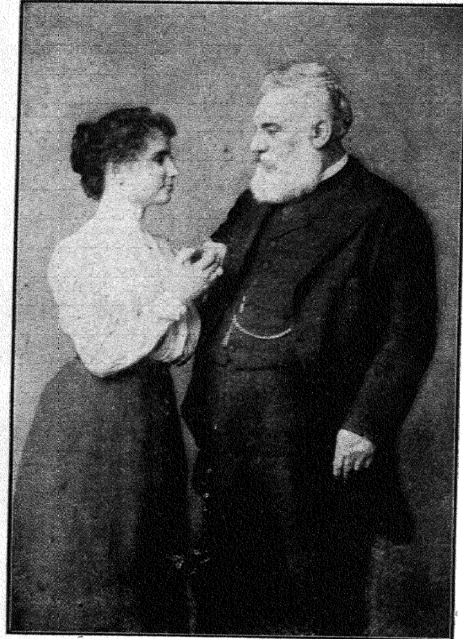


هیلن کیلر سات سال کی عمر میں



ہیلن کیلر اور جمبو

Photo Art Press, LAHORE.



مس کیلر اور ڈاکٹر گراہم بل



هیلن کیلر موسیقی کا تموج محسوس کر رهی هے

PICTORIAL ENGRAVING Co.

یونانیوں سے آشنا ہونے کا اتفاق ہُوا تھا۔ جو اپنے ملک کے قصّوں پر بہت نازاں اور ان کے متعلق اپنا جوش و خروش ظاہر کرتے تھے۔ برعکس اس کے مجھے ایک بھی عبرانی یا مصری سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے مَیں نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ یہ لوگ بالکل وحشی ہیں۔ اور ان کے قصّے بھی تمام فرضی ہیں اسی وجہ سے ان کے نام عجیب و غریب ہیں۔ اور ان کے قصوں میں تکرار بہت زیادہ ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ مجھے یونانی کنیت کی طرز کے نام کبھی طرفۃ الاسم معلوم نہیں ہُوئے۔ بایں ہمہ انجیل کی اس شان و شوکت کو جو بچپن کے بعد مجھ پر روشن ہُوئی۔ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ کئی سالوں تک مَیں نے اس کا مطالعہ بیش از پیش مسرت اور تاثیر کے ساتھ کیا ہے۔ اور مَیں اس کے مقابلے میں اور کسی کتاب کی اتنی شائق نہیں ہوں تاہم انجیل میں بہت سا مواد ایسا ہے۔ جس کے خلاف میری ہستی کی ایک ایک قوّت بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مَیں اس ضرورت کا خیال کر کے پچھتاتی ہوں۔ جس نے مجھے اس کے مطالعہ پر ابتدا سے آخر تک مجبور کیا۔ مَیں نہیں سمجھتی کہ وہ علم جو مَیں نے انجیل کی تاریخ اور اس کے ماخذوں کے متعلق حاصل کیا ہے۔ اُن ناگوار تفصیلات کے مقابلے میں جن پر متوجہ ہونے کے لئے مجھے مجبور ہونا پڑا۔ کوئی معاوضہ یا صلہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مجھ سے پوچھو تو مسٹر ناولز کی تائید کرتے ہُوئے مَیں کہونگی کہ قدیم زمانے کے علم ادب میں سے تمام بھونڈا اور وحشیانہ مواد نکال ڈالنا چاہئے۔ اگرچہ مَیں ساتھ ہی یہ بھی پسند نہیں کرتی۔ کہ اُن تصانیف عظمےٰ کو کمزور کر کے پایۂ صداقت سے گرایا جائے انجیل میں ایستھر[۵] کی کتاب پُر اثر اور رعب آفرین ہے۔ اور اس کے اندازِ بیان میں بلاواسطہ طور پر سادگی کی ایک شان پائی جاتی ہے۔ کیا اس نظارے سے بڑھ کر اور بھی کوئی پُرعظمت سین ہو سکتا ہے۔ جس میں ایستھر اپنے بدچلن خاوند

---

[۵] ایستھر یا آستر۔ یہ توریت کا ایک باب ہے۔ اخسویرس بادشاہ ہندوستان سے کوش تک سلطنت کرتا تھا۔ ۱۲۷ صوبے اس کی عملداری میں تھے۔ ایک دن اس بادشاہ کا دل مےنوشی سے خوش تھا۔ اس نے حکم دیا۔ کہ اس کی ملکہ وشتی کو شاہی تاج سر پر رکھ کر بادشاہ کے حضور میں لائیں۔ تاکہ اسکا جمال لوگوں اور امیروں کو دکھایا جائے۔ کیونکہ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ وشتی نے اس طرح آنے سے انکار کیا۔ بادشاہ کو بہت غُصّہ آیا۔ اور اُسنے امرا سے پوچھا کہ وشتی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اُنہوں نے خُوبصورت کنواریاں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں۔ تاکہ وہ اُن میں سے اپنے لئے کوئی نئی ملکہ انتخاب کرے انہیں اریوں میں مردکی یہودی کی متبنٰے لڑکی آستر بھی تھی۔ جو بادشاہ کو بہت پسند آئی اسی اثنا میں ملک کے تمام یہودیوں پر بادشاہ کا غضب نازل ہُوا یعنی انہیں قتل کرنے کا مشورہ ہونے لگا۔ آستر نے بادشاہ کے منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے اسے اس فعل سے باز رکھا۔ آستر انجیل کی نیک طینت خواتین میں سے شمار کی جاتی ہے (مترجم)

کے روبرو کھڑی ہوتی ہے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کے غضب سے اسے بچانیوالا اور کوئی نہیں ہے۔ بایں ہمہ نسوانی خوف وخطر پر قابو پاکر وہ اس کے نزدیک آتی ہے۔ وہ شریف ترین جذباتِ حبّ الوطنی کے ساتھ مملو ہوکر ایک ہی بات کو دہراتی ہے یعنی "اگر میں فنا ہوتی ہوں تو ہوجاؤں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں لیکن اگر میں زندہ رہونگی تو میرے اہلِ وطن زندہ رہیں گے۔" روتھ[لے] کی کہانی بھی کس قدر مشرقی رنگ کی ہے۔ تاہم اُن سادہ دیہاتی لوگوں کی زندگی؛ فارس کے دارالخلافے کے رہنے والوں سے کتنی مختلف ہوتی ہے! روتھ اسقدر نمکحلال اور نیکدل عورت ہے کہ ہم اس سے اُنس کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ جبکہ وہ کھیت کاٹنے والوں کے درمیان ہوا سے جھومتے ہوئے کھیت میں استادہ نظر آتی ہے۔ اس کی خوبصورت بے غرض رُوح روشن ستارے کی طرح جو ایک تاریک اور بے رحمی کے زمانے والی رات میں چمکتا ہو۔ درخشاں نظر آتی ہے۔ روتھ جیسی محبت جو گہرے نسلی تعصب، اور متخاصم عقائدِ دین سے بالاتر ہے۔ دُنیا بھر میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ انجیل کے مطالعہ سے مجھے ایک گہرا، اور تسکین بخش احساس یہ ہوتا ہے۔ کہ ظاہری اشیاء ایک عالمِ فانی سے اور باطنی اشیاء ایک عالمِ غیر فانی سے تعلق رکھتی ہیں۔

جب سے میں کتاب خوانی کے قابل ہوئی ہوں مجھے ایسا کوئی وقت یاد نہیں جبکہ میں شیکسپیر کی دلدادہ نہ رہی ہوں۔ مجھے یہ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ کہ میں نے لیمب صاحب کی تصنیف "شیکسپیر کی کہانیاں" کب پڑھنی شروع کی تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ پہلے پہل میں نے اُنہیں بچپن کی حیرت اور بچوں کے سے تصورات کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ میکبیتھ کا ڈراما پڑھ کر میں ازحد متاثر ہوئی اسے ایک مرتبہ پڑھ لینے سے قصّے کی تمام تفصیلات میرے ذہن نشین ہوچکی تھیں، میں مدتوں تک اس کی جادوگرنیوں اور

[لے] روتھ۔ یاروت۔ یہ بھی توریت میں ایک باب کا عنوان ہے الیملک اور اسکی جورو نعومی قحط کے سبب اپنے ملک بیت لحم سے نکلکر موآب کے ملک میں جا بسے۔ ان کے دو بیٹوں نے موآب کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ ان عورتوں میں سے ایک کا نام روت تھا۔ دس برس کے بعد ان دونوں بیٹوں کی وفات پر نعومی اپنی بہو روت کے ساتھ بیت لحم کو لوٹی۔ نعومی کے خاوند کا ایک رشتہ دار الیملک کے گھرانے میں بڑا مالدار زمیندار تھا۔ اس کا نام بوعز تھا۔ روت اس کے کھیت میں بالیں چننے کے لئے جاتی ہے۔ اپنی ساس نعومی کے اشارے سے وہ بوعز کے گھر میں مفلسی سے پناہ لیتی ہے۔ بوعز اس کی سادگی، اور پاکدامنی کے سبب اس کے دامِ اُلفت کا اسیر ہوجاتا ہے۔ اور اس سے شادی کرلیتا ہے (مترجم)

بھوتوں کو عالم رویا میں دیکھتی رہی۔ میں خنجر اور لیڈی میکبتھ کے ننھے سے ہاتھ کو جس پر خون کا خوفناک نشان اس غمزدہ ملکہ کی طرح اصلی نظر آتا تھا۔ تصوّر میں تجھی دیکھ سکتی تھی۔

میکبتھ پڑھ کر میں نے "شاہ لیر"[۵۱] کا مطالعہ کیا۔ اور میں اس دہشتناک نظارے کو کبھی نہیں بھولوں گی جس میں گلاسٹر کی آنکھیں نکال ڈالی جاتی ہیں۔ میں اسے پڑھ کر غضب آلودہ ہو گئی۔ میری انگلیاں بے حس ہو گئیں۔ میں دیر تک پتھر بن کر بیٹھی رہی۔ میرے سر کے اطراف میں خون تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اور جسقدر ایک بچہ محسوس کر سکتا ہے اس قدر نفرت میرے دل میں جمع ہو گئی۔ شائیلاک[۵۲] یہودی، اور شیطان دونوں سے میں بیک وقت آشنا ہوئی ہونگی۔ کیونکہ ان دونوں کا تسلسل دیر تک میرے دل میں قائم رہا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ میں ان دونوں کی حالت پر بہت افسوس کرتی رہی۔ میں نے خفیف سا احساس یہ کیا تھا کہ یہ دونوں کیرکٹر باوجود ان کی کوشش کے کبھی نیک بن ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی اس کام میں ان کی مدد پر آمادہ نہیں۔ اور نہ کوئی انہیں یہ موقع دینا چاہتا ہے۔ تاہم اب تک بھی میں انہیں بالکل مردود تصوّر نہیں کرتی ہوں۔ بعض اوقات میں یہ محسوس کیا کرتی ہوں۔ کہ دنیا کے تمام شائیلاک جوڈا[۵۳] اور شیاطین نیکی کے عظیم گردش کرنے والے چرخے کے شکستہ ڈنڈے ہیں۔ جو کسی نہ کسی وقت تک جڑ کر چرخے کو مسلم کر سکتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ پہلی مرتبہ شکسپیر پڑھکر میرے لئے میں ناگوار محسوسات پیدا ہوئے۔ اس کے حیرت انگیز چمکیلے اور تخیل آفریں ڈراموں نے جو مجھے اب بے حد پسند ہیں۔ پہلے پہل مجھ پر کوئی اثر پیدا نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ وہ بچپن کی خوشیوں کو ظاہر کرتے تھے۔ لیکن شاید بچے کی قوتِ حافظہ سے بڑھ کر اور کوئی شے متلون نہیں ہوتی ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کن چیزوں کی یاد سمائیگی اور کن کی نہیں۔ اس کے بعد اب تک میں نے شکسپیر کے

---

[۵۱] یہ بھی شکسپیر کی مشہور ٹریجڈی ہے۔ گلاسٹر اسی ناٹک کا کیرکٹر ہے۔ ٹریجڈی اس ناٹک یا افسانے کو کہتے ہیں۔ جس کا انجام دردناک ہو۔ کامیڈی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ (مترجم)

[۵۲] شکسپیر انگریزی ڈراما نویس کے ناٹک "وینس کا سوداگر" میں ایک کیرکٹر کا نام ہے جو اپنی ہوسِ زر اور ظالمانہ قرضخواہی کے لئے مشہور ہے۔ ایک مقروض سے روپیہ نہ ادا ہونے پر اسکے جسم کا آدھ سیر گوشت کاٹنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن بالآخر پورشیا کی مدد سے ناکام رہتا ہے (مترجم)

[۵۳] حضرت عیسٰیؑ کا ایک حواری، جس نے ان کو یہودی دشمنوں کے حوالے کیا تھا۔ اور انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کو صلیب پر چڑھا دیا تھا۔ (مترجم)

ناٹک متعدد بار پڑھے ہیں۔ اور ان کے بعض حصص مجھے حفظ بھی ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں بتا سکتی کہ مجھے ان میں سے کونسے اجزا سب سے زیادہ پسند ہیں۔ ان کے متعلق میری مسرت ایسی ہی متغیر رہتی ہے۔ جیسے میری طبیعت کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گیت اور چودہ سطور کی نظمیں میرے لئے ایسی ہی پُرمعنی ہیں جیسے اس کے ڈرامے۔ لیکن شیکسپیر پڑھنے کے شوق کے باوجود اس کے اشعار کا تمام مطلب اس حد تک سمجھنا دشوار ہے۔ جتنا کہ اس کے نقادوں اور شرح کرنے والوں نے بیان کیا ہے میں ان کی شرح کو بھی یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی ہوں لیکن اس کا انجام ہمیشہ شکستہ حوصلگی اور گھبراہٹ ہوتا تھا۔ پس میں نے خفیہ طور پر اپنے دل سے عہد کر لیا کہ میں اس قسم کی مزید کوشش کبھی نہیں کرونگی۔ میرا یہ عہد پروفیسر کٹریج کی شاگردی ہی میں شیکسپیر پڑھنے سے ٹوٹا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ دنیا میں اور شیکسپیر کے کلام میں بہت سی اشیا ہیں۔ جو میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور میں اس سے خوش ہوتی ہوں۔ کہ بلحظہ ان اشیا پر سے نقاب اٹھتی جا رہی ہے۔ اور حسن اور تخیل کی نئی سے نئی بادشاہت بتدریج میرے پیش نظر ہو رہی ہے۔

نظم سے دوسرے درجے پر مجھے تاریخ مرغوب ہے۔ اس مضمون کی جو کتاب مجھے دستیاب ہوئی، اسے میں نے پڑھ ڈالا۔ خشک سنون اور واقعات کی فہرست سے لے کر گرین[۵۱] کی دلچسپ اور بے تعصبانہ "تاریخ انگلستان" تک اور فری مین[۵۲] کی "تاریخ یورپ" سے ایمرٹن کی "ازمنۂ وسطےٰ" تک بھی میرے مطالعہ سے گزریں۔ سب سے پہلی کتاب جسے پڑھ کر مجھے تاریخ کے مطالعہ کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ وہ سوئنٹن[۵۳] کی "تاریخ دنیا" تھی۔ جو مجھے اپنی تیرھویں سالگرہ پر تحفۃً ملی تھی۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ اس کتاب کے واقعات معتبر خیال نہیں کئے جاتے۔ تاہم میں نے اسے اب تک اپنے قیمتی ذخیرۂ اشیاء میں محفوظ رکھا ہے۔ اسی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ انسانی نسلیں کس طرح

---

۵۱ جان رچرڈ گرین۔ نہایت قابل انگریزی مورخ تھا۔ تاریخ پیدائش ۱۸۳۷ء تاریخ وفات ۱۸۸۳ء

(مترجم)

۵۲ ایڈورڈ آگسٹس فری مین (۱۸۲۳ء۔۱۸۹۲ء) انگریزی تاریخ دان تھا۔

(مترجم)

۵۳ ولیم سوئنٹن (۱۸۳۳ء۔۱۸۹۲ء) سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ امریکہ میں بود و باش رکھتا تھا۔ اپنے وقت کا قابل مورخ گذرا ہے

(مترجم)

ایک مُلک سے دوسرے مُلک تک پھیل گئیں۔ انہوں نے بڑی بڑی بستیاں بنائیں۔ شہر آباد کئے۔ اور کس طرح چند بڑے بڑے حکمران، یعنی یونانی ٹائٹن[۵۱] ہر حصّہ زمین کو مغلوب کر کے اسے اپنے پاؤں تلے رکھتے رہے۔ اور ایک قطعی قول کے ساتھ انہوں نے لکھوکھا انسانوں پر راحت کے دروازے کھول دئے۔ اور اتنی ہی اور مخلوق پر اس کے دروازے بند کر ڈالے۔ کس طرح مختلف قوموں نے علم وفن میں ابتدا کی اور آنے والی قومی ترنسلوں کے لئے علم وحکمت کے دروازے کھولے۔ کس طرح تہذیب ایک پست زمانے میں اپنے آپ کو قربان کر کے شمالی دنیا کے شریف تر فرزندوں کے ہاتھ ققنس کی طرح دوبارہ زندہ ہوئی۔ اور کس طرح آزادی، رواداری اور تعلیم کی برکت سے عظیم الشان ہستیوں اور دانا بزرگوں نے تمام دُنیا کی نجات کے دروازے کھول دئے ہیں۔ میں اپنے کالج کی پڑھائی کے دوران میں فرانسیسی اور جرمن علم ادب سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو چکی ہوں۔ اپنی روزمرہ زندگی اور علم ادب میں

جرمن ہمیشہ قوت کو حُسن پر، اور حقیقت کو رسم ورواج پر فوقیت اور فضیلت دیتے ہیں۔ وہ جو کام کرتے ہیں۔ اسے گرمجوشی اور ہتھوڑے کی سی قوت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ کلام کرتے ہیں تو اس لئے کہ اگر وہ اپنے خیالات کو جوان کی روح میں طپش پیدا کر رہے ہیں اظہار کا موقع نہ دیں گے۔ تو ان کا دل جل کر راکھ ہو جائیگا۔ علاوہ ازیں جرمن لٹریچر میں ایک قسم کا نفیس حجاب پایا جاتا ہے۔ لیکن میں نے اس کی بڑی شان وشوکت یہ دیکھی ہے کہ اس میں عورت کی ایثار آمیز محبت کی شناخت، اور قدرومنزلت پائی جاتی ہے۔ جو جرمن کے لئے مایۂ ناز اور ایک بہت بڑی اجر دینے والی قوت ہے۔ یہ خیال تمام جرمن لٹریچر میں حاوی نظر آتا ہے۔ اور گوئٹے کی نظم فاوسٹ میں بھی اس کا اظہار صوفیانہ انداز میں اس طرح کیا گیا ہے:-

"تمام عارضی اشیاء کا وجود جو اس دُنیا میں بھیجی گئی ہیں۔ بمنزلہ علامات کے ہے۔ کائنات ارضی کی ناتمام اور ناکافی چیزیں یہاں ہر لحظہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن فقط ایک شے ہے جو ہمیں بلندی کی طرف کشاں کشاں لئے جاتی ہے۔ اور وہ عورت کی رُوح ہے۔"

تمام فرانسیسی مُصنّفین میں جن کا کلام میں نے مطالعہ کیا ہے مجھے مولیر اور ریسین سب سے زیادہ پسند ہیں۔ بانزیک

[۵۱] یونانی علم الاصنام میں دیوتاؤں کے سب سے پہلے بزرگوں کو کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک وہ زمین کے اوّلین فرزند ہیں۔ یہ بے حد قدآور اور طاقتور تھے۔ انگریزی اصطلاح میں بطور صفت ہر اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو بہت لمبی چوڑی ہو۔ (مترجم)

بھی عمدہ نکات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور " میری می " کی نظم میں بعض ایسے حصے ہیں۔ جو پڑھنے والے کے دل میں اس طرح کی شیریں خلش پیدا کرتے ہیں جیسے نسیم سحری کا ایک تیز جھونکا ' الفریڈ ڈی موسیٹ بعض ناممکن امور بیان کرتا ہے میں وکٹر ہیوگو افسانہ نویس کی مداح ہوں۔ میں اس کی ذکاوتِ طبع اس کی شوخی اس کے اندازِ افسانہ نویسی کو پرکھ سکتی ہوں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں۔ جن کے کلام کو میں بے حد اشتیاق کے ساتھ پڑھا کرتی ہوں تاہم یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ وکٹر ہیوگو، گوئٹے اور شلر اور سب بڑی بڑی قوموں کے ممتاز شعراء دائمی اشیاء کے شرح کرنے والے ہیں۔ اور میری روح ان خطوں میں ان کی پیروی کرتی ہے۔ جہاں حسن، حقیقت اور نیکی سب مل کر ایک ہی ہستی بن جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہ میں نے اپنے کتابی احباب کا تذکرہ کرنے میں طوالت سے کام لیا ہے۔ تاہم میں نے فقط ان مصنفین ہی کا ذکر کیا ہے۔ جو مجھے بہت زیادہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے شاید ناظرین بآسانی یہ نتیجہ اخذ کریں گے۔ کہ میرے احباب کا دائرہ بہت ہی محدود اور غیر جمہوری ہے۔ لیکن یہ نتیجہ غلطی سے خالی نہیں، مجھے بہت سے مصنف مختلف وجوہات کی بناء پر مرغوب ہیں۔ مثلاً کارلائل[51] اس لئے پسند ہے۔ کہ وہ تمام ظاہر داری پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اس میں ایک ناہمواری اور کرختن پن پایا جاتا ہے۔ ورڈزورتھ اس لئے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ انسان اور نظام قدرت کی وحدت کا سبق سکھاتا ہے۔ ہنٹ[52] کی نست میں عجیب مزا ہے۔ ہیرک کی نظموں میں ایک حیرت اور گل لالہ اور گلاب کی سی خوشبو پائی جاتی ہے۔ وہیٹر[54] کے کلام میں گرمجوشی اور اخلاقی راستبازی ہویدا ہے۔ چونکہ مجھے وہیٹر سے شرفِ نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اس لئے ان کی نظموں کو پڑھنے سے ان کی دوستی کی ہلکی سی یاد تازہ ہو کر اس لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ میں مارک[55] ٹوین کو بھی پسند کرتی ہوں۔ اور کون ہے جو نہیں کرتا۔ ان کو تو دیوتا بھی چاہتے تھے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ان دیوتا لوگوں نے اس مصنف کے دل میں تمام دانائی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں حکمت سے لبریز ہو کر وہ تاریک بین نہ ہو جائیں۔ انہوں نے ساتھ ہی ان کے قلب کے دریا پر ایمان اور محبت کی قوس قزح کا ایک پل باندھ دیا۔ مجھے اسکاٹ[56] کا کلام اپنی تازگی، بے ساختہ پن

---

۵۱ سکاچ نقاد اور مورخ (۱۷۹۵ء - ۱۸۸۱ء) (مترجم)

۵۲ انگریزی انشاپرداز اور شاعر (مترجم)

۵۳-۵۵ امریکن شاعر اور مصنفین ہیں (مترجم)

۵۶ مشہور انگریزی شاعر و ناول نویس (مترجم)

اور دیانت داری کے باعث بھاتا ہے۔ غرض مجھے تمام ان مصنفین سے رغبت ہے جن کے قلب سوویل کی طرح روشن خیالی کی فضا میں اُبھرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مسرت اور نیک نیتی کے فوارے ہیں جن میں سے کبھی کبھار غیظ و غضب کی بوچھاڑ اور گاہے گاہے ہمدردی اور رحم کی شفا دینے والی دھار نکل پڑتی ہے! قصہ مختصر علم ادب میری خیالی دنیا ہے اور ادبی دنیا میں چلنے پھرنے کا حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

حواس کی کوئی رکاوٹ ایسی نہیں جو مجھے میرے کتابی دوستوں کی شیریں گفتگو اور مہربان کلمات سے محروم کر سکے۔ یہ دوست بلا تکلف اور بغیر کسی بد نمائی کے مجھ سے بات چیت کرتے ہیں۔ ان دوستوں کی وسیع محبت اور آسمانی سخاوت کے مقابلے میں وہ چیزیں جو میں نے حاصل کی ہیں۔ یا جو مجھے سکھائی گئی ہیں مضحکہ انگیز طور سے بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔

بائیسواں باب تفریح کے دوسرے سامان کھلی ہوا اور کشتی کی سیر دیہاتی اور شہری زندگی کا مقابلہ بائیسکل کی سواری شطرنج اور تاش کا کھیل درختوں اور پودوں سے اُنس و دلبستگی قصہ گوئی اور عجائب گھر کا لطف تصاویر اور تھیٹر

مجھے یقین ہے کہ ناظرین نے پچھلے باب کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا ہوگا۔ کہ کتب ہی میرا ذریعہ تفریح ہیں۔ نہیں بلکہ میری تفنن طبع کے ذرائع بہت سے اور بھی ہیں۔ اس داستان کے دوران میں ایک سے زیادہ مرتبہ میں نے دیہاتی اور کھلی ہوا کی زندگی سے اپنے شغف کی طرف اشارہ کیا ہے جب میں چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میں نے کشتی چلانا اور تیرنا سیکھ لیا تھا۔ اور موسم گرما میں جبکہ میں ریاست میساچوسٹس کے مقام رینتھم میں مقیم ہوں تو میرا بہت سا وقت اپنی کشتی میں ہی گزرتا ہے مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز سے خوشی حاصل نہیں ہوتی کہ جب میرے دوست میری ملاقات کو آئیں تو میں انہیں کشتی کی سیر کرانے لے جاؤں۔ اس میں شک نہیں کہ میں اپنی کشتی کو

اچھی طرح نہیں چلا سکتی، یہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص کشتی کے پچھلے حصے کی طرف بیٹھ کر اس کے آلۂ رہنمائی کو ہاتھ میں لے۔ تاکہ میں کشتی کو حرکت میں لاؤں۔ لیکن بعض اوقات میں اس آلے کے بغیر بھی کشتی چلاتی ہوں۔ میرے لئے یہ بھی ایک تماشا ہے کہ میں سمندری گھاس، اس کے پھولوں اور ساحل پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کی خوشبو کے ذریعے اُسے سیدھا چلانے کی کوشش کروں۔ میں چمڑے کے پٹے والے چپوؤں کا استعمال کرتی ہوں۔ ان کی مدد سے چپو اپنے آہنی حلقوں میں سے باہر نہیں نکلتے اور پانی کی یکساں کشش سے مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں چپو برابر تُلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح میں یہ بھی معلوم کر لیتی ہوں۔ کہ میں کس وقت آبی رو کی

سمت کے خلاف کشتی چلا رہی ہوں۔ میں ہوا اور لہروں کیساتھ جدو جہد کرنا پسند کرتی ہوں۔ اس سے زیادہ اور کوئی چیز موجب تفریح نہیں۔ کہ تم اپنی چھوٹی سی مضبوط کشتی کو اپنی ارادی اور عضلاتی قوت کی فرمانبرداری پر مجبور کرکے لہروں پر پھسلتے اور جھولتے ہوئے چلے جاؤ۔ اور پانی کے شاندار اور مستقل ابھار کو محسوس کرو۔ مجھے ڈونگہ کشتی چلانے میں بھی حظ آتا ہے۔ اور ناظرین یہ معلوم کرکے مسکرائیں گے کہ میں اس شغل کو بالخصوص چاندنی رات میں پسند کرتی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں چاند کو چیڑ کے درخت کے پیچھے سے طلوع ہوتے اور آسمان کی بلندی پر چپکے چپکے اوپر چڑھتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ جبکہ وہ ایک چمکدار راستہ بناتے ہوئے ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم میں اتنا جانتی ہوں کہ ماہتاب آسمان پر موجود ہے۔ اور جس وقت میں کشتی کے سرہانوں پر لیٹ کر پانی میں اپنا ہاتھ ڈالتی ہوں۔ تو مجھے اپنے تخیل میں چاند ایک ملبوس حسین عورت کی مانند نظر آتا ہے۔ جس کے چلنے سے مجھے گویا اس کے لباس کی سرسراہٹ کی محسوس ہونے لگتی ہے بعض اوقات اس حالت میں کوئی دلیر ننھی مچھلی میری انگلیوں کے بیچ میں سے گزر جاتی ہے۔ اور اکثر دفعہ آبی پھول اپنی شرمیلی ادا کے ساتھ میرے ہاتھ کو چھوتے ہیں بسا اوقات جبکہ میں کسی کھاڑی میں پناہ گزیں ہو کر کھلے سمندر میں آتی ہوں تو مجھے یکایک کرۂ ہوائی کی کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک چمکیلی روشن حرارت میرے ارد گرد لپٹ جاتی ہے اور میں یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ یہ گرم ہوا پانی سے اٹھ رہی ہے یا ان درختوں سے آئی ہے جنہیں سورج نے گرمایا ہو شہر کے مرکز یا طوفانی سرد دنوں اور رات کی خنکی سے بھی مجھے یہی احساس ہوا کرتا ہے۔ گویا کسی عزیز کے گرما گرم لبوں نے میرے رخساروں کو چوم لیا۔ میری مرغوب طبع تفریح جہاز کا سفر ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء کے موسم گرما میں مجھے جزیرہ نما نووا اسکوشیا میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پیشتر مجھے سمندر دیکھنے کے اسقدر پر لطف مواقع کبھی میسر نہیں آئے۔ چند دن اس ملک میں جس کے متعلق لانگ فیلو[51] کی ایک نظم نے گویا سحر کا دریا بہا دیا ہے۔ بسر کرنے کے بعد میں اور مس سلیون صاحبہ ہیلیفیکس کو روانہ ہوئیں۔ جہاں ہم نے موسم گرما کا بیشتر حصہ بسر کیا۔ یہ بندرگاہ ہماری راحت اور ہماری بہشت تھا۔ بیڈ فورڈ بیسن، جزیرہ میکناب، یارک ریڈوٹ، اور نارتھ ویسٹ آرم تک ہم نے کیا ہی شاندار سفر کئے! رات کے وقت بڑے بڑے خاموش جنگی جہازوں کے سائے میں ہم نے کتنے عجیب اور تسکین آور گھنٹے بسر کئے! یہ تمام مشاہدات اتنے دلچسپ اور پُر کیفیت تھے۔ کہ ان کی یاد

---

۵۱ مشہور امریکن شاعر ہے۔ تاریخ پیدائش ۱۸۰۷ء تاریخ وفات ۱۸۸۲ء (مترجم)

ہی ایک دائمی سرچشمہ مسرت ہے! ایک دن ہمیں ایک واقعہ پیش آیا۔ یعنی نارتھ ویسٹ آرم کے پانی میں کشتیوں کی ایک دوڑ ہوئی تھی۔ اس دوڑ میں مختلف جنگی جہازوں کی کشتیاں مشغول تھیں۔ ہم بھی بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بادبان والی کشتی میں بیٹھ کر دوڑ دیکھنے چلی گئیں۔ سینکڑوں بادبان والی کشتیاں ادھر سے اُدھر ہمارے اردگرد گشت لگا رہی تھیں۔ اور سمندر ساکن تھا۔ جب دوڑیں ختم ہوئیں اور ہم نے گھر کا رُخ کیا۔ تو ہماری جماعت میں سے ایک شخص نے سمندر پر سے ایک سیاہ بادل اُٹھتا ہوا دیکھا۔ یہ بادل بڑھ بڑھ کر پھیل گیا۔ حتےٰ کہ اُس نے تمام آسمان کو ڈھانپ لیا۔ ہوا زور سے چلی۔ اور سمندر کی لہریں غضبناک ہو کر کسی نامعلوم سدِّ راہ پر تھپیڑے مارنے لگیں۔ ہماری ننھی کشتی نے بھی بے دھڑک ہو کر طوفان کا مقابلہ کیا۔ اپنے پھیلے ہوئے بادبان اور مضبوط رسوں کے ساتھ وہ ہوا کے تخت پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ وہ کبھی تو چھوٹی لہروں پر اپنی خرام دکھاتی تھی۔ اور کبھی کسی مہیب لہر کے سینے پر چڑھ کر آگے کی طرف اُچھلنے لگتی تھی۔ لیکن ہر مرتبہ سمندر اپنے شوریدہ غضب کے ساتھ اسے تھپیڑ مار کر نیچے گرا دیتا تھا۔ اسی حالت میں کشتی کا بڑا بادبان دھڑام سے نیچے گرا۔ اور ہم یونہی ٹھوکریں کھاتے کھاتے بادِ مخالف کے ساتھ کشتی لڑتی رہیں۔ جو ہمیں اِدھر اُدھر تندی سے دھکے دے رہی تھی۔ ہمارا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اور گھبراہٹ کے مارے ہاتھوں میں سنسنی سی محسوس ہونے لگی۔ پھر بھی ہم پر بدحواسی اور ہراس طاری نہیں ہوا کیونکہ ہمارے دل بحری لٹیروں کی مانند تھے۔ اور ہمیں یہ علم تھا کہ ہمارا کشتی بان اس حالت پر ضرور قابو پا ہی لیگا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں اور بحری تجربے والی آنکھ نے بہت سے طوفانوں میں سے سلامتی کے ساتھ عبور کیا تھا۔ بڑے جہازوں، اور ساحل پر کی توپ چلانے والی کشتیوں نے پاس سے گزرتے وقت ہماری سلامی اُتاری۔ اور ملّاحوں نے ہماری اس ایک بادبان والی کشتی کے ناخدا کے لئے تحسین و آفرین کے نعرے بلند کئے۔ جو اس قدر جرأت کے ساتھ طوفان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ بالآخر سردی، بھوک اور تکان کے مارے ہم کشتیوں کے بندھ پر پہنچ ہی گئے۔

میں نے آخری موسم گرما نیو انگلینڈ کے ایک نہایت خوشگوار گاؤں میں اس کے ایک نہایت خوشنما کنارے پر بسر کیا۔ یہ گاؤں یعنی رینتھم جو ریاست میسا چوسٹس میں واقع ہے۔ قریباً میرے تمام رنج و راحت کے مشاہدوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ کئی سالوں تک مسٹر جے ای چیمبرلین کا گھر ریڈ فارم (سرخ کھیت) جو کنگ فلپ کے تالاب کے قریب ہے۔ میری سکونت رہا۔ مجھے اُن مخلص دوستوں کی عنایات اور مسرت کے دن، جو ان کے ساتھ بسر ہوئے دلی شکر گزاری کے ساتھ یاد ہیں۔ ان کے بچوں کی پیاری ہم نشینی میرے

نزدیک بہت پُر وقعت تھی۔ جنگلوں میں اور سمندر پر میں ان کے تمام کھیلوں اور سیر و تفریح میں شریک ہوتی تھی۔ ننھے بچوں کی بات چیت اور ان کی وہ مسرت، جو وہ مجھ سے پریوں اور خیالی ہستیوں کی کہانیاں سُنکر حاصل کرتے تھے۔ ایک دلخوش کن یاد ہے۔ مسٹر چیمبرلین نے مجھے جنگلی پھولوں اور درختوں کے اسرار سے آگاہ کیا۔ یہانتک کہ مَیں نے محبت کے کانوں سے شاہ بلوط کے درخت میں پانی کی کشش کی آواز سُنی، اور آفتاب کو اس درخت کی ایک چھت سے دوسری چھت تک حرکت کرتے ہُوئے پایا۔ بقولِ شاعر۔ "جس طرح درخت کی جڑیں تاریک زمین کے اندر چھپی ہوئی اس کی اُوپر کی ٹہنیوں اور پتّوں کی شادابی میں شریک ہوکر سُورج کی چمک، وسیع ہوا اور پردار مخلوق کی ہستی کا اندازہ لگا سکتی ہونگی" اسی طرح میں بھی اس قسم کی ان دیکھی چیزوں کو سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سب میں یہ ملکہ موجود ہے کہ ہم ان اثرات اور جذبات کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ جو ابتدائے آفرینش سے بنی نوع آدم کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر فرد بشر سبز زمین، اور بہتے ہُوئے پانی کے متعلق ایک زیر وجدانی یاد داشت[۵۱] رکھتا ہے۔ نابینا یا بہرا ہونا، اسے گزشتہ نسلوں کے موروثی اثرات سے محروم نہیں کر سکتا۔ یہ موروثی استعداد، ایک قسم کی حس ساؔدس[۵۲] ہے۔ نہیں بلکہ یہی ایک واحد روحانی حس ہے۔ جو تمام اشیاء کا ادراک ایک ہی مرتبہ دیکھ کر، سُنکر اور ٹٹولنے سے کرتی ہے۔

رینتھم میں بہتیرے درخت ہیں جن سے مجھے اُنس ہے۔ ان میں سے ایک شاندار شاہ بلوط کا درخت تو میری آنکھوں کا تارا ہے۔ اور مَیں اپنے تمام احباب کو ان درختوں کے بادشاہ کی زیارت کے لئے لے جاتی ہوں۔ یہ درخت کنگ فلپ۔ کے تالاب کے اُوپر ایک بلند عمودی ٹیلے پر واقع ہے۔ اور جو لوگ درختوں کے علم میں مہارت رکھتے ہیں ان کا قیاس ہے کہ اس کی عمر آٹھ سو یا ایک ہزار

---

۵۱ نفس کی "زیر وجدانی کیفیات" وہ ہیں۔ جن میں ہم کسی خاص فعل کے دوران میں کسی اور خیال کی پیروی کر کے اس کے بموجب عمل بھی کرنے لگیں۔ کتاب پڑھتے پڑھتے ہمارا قلم گر پڑتا ہے ہم نظر کو کتاب پر سے ہٹائے بغیر اسے اُٹھا لیتے ہیں، دورانِ گفتگو میں، میز پر سے گلاس تھام لیتے ہیں۔ خط لکھتے وقت کمرے کی تمام اشیا سے ہمارا باخبر ہونا، بچّے کا آکر دروازہ کھولنے اور بند کرنے کا ہمیں بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ ہم تحریر میں محو ہوتے ہیں۔ یہ کیفیت تعلّم اسی ذیل میں شمار کی جاتی ہے۔ جو ہمارے اصلی وجدان سے ایک درجہ نیچے ہے۔ (مترجم)

۵۲ ظاہری حواس پانچ ہیں۔ جنہیں "حواسِ خمسہ" کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ فلاسفہ نے ایک چھٹی حس بھی دریافت کی ہے۔ جو باطنی ہے۔ اور اسکی مدد سے ہمیں بعض ان دیکھی اشیاء کا علم ہوتا ہے۔ جیسے ہستی باری تعالےٰ آخرت وغیرہ (مترجم)

سال کی ہو گی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اسی درخت کے نیچے، بہادر امریکن انڈین سردار شاہ فلپ، آخری مرتبہ زمین اور آسمان کو دیکھتے ہوئے جاں بحق ہوا تھا۔ ایک اور درخت سے بھی مجھے اُنس تھا۔ جو اس عظیم شاہ بلوط کی نسبت زیادہ حلیم اور قابل رسائی تھا۔ یہ ایک لنڈن کا درخت تھا۔ جو "سُرخ کھیت" کے صحن میں اُگا ہوا تھا۔ ایک خوفناک برقی طوفان کے دوران میں سہ پہر کے وقت مجھے مکان کی ایک طرف سے ہولناک دھڑکا محسوس ہوا۔ اور پیشتر اس کے کہ لوگ مجھے آکر بتاتے، مَیں نے جان لیا۔ کہ یہ درخت گر پڑا ہوگا۔ ہم اس بہادر درخت کو دیکھنے کے لئے باہر آئیں۔

جس نے اتنے طوفانوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اُسے اوندھا پڑا ہوا دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ اور مَیں نے خیال کیا کہ اس درخت نے کس قدر قوت کے ساتھ کھڑا رہنے کی جدوجہد کی ہے۔ اور گرا بھی ہے تو کس شان وشکوہ کے ساتھ گرا ہے!

مجھے یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مَیں بالخصوص گزشتہ موسم گرما کا حال بیان کرنے لگی تھی۔ جونہی مجھے امتحانات سے کلّی فراغت حاصل ہوئی۔ مَیں استانی صاحبہ کے ہمراہ اس سبز کنارہ زمین پر فوراً پہنچ گئی۔ جہاں تین جھیلوں میں سے ایک کے قریب ہماری ایک جھونپڑی موجود ہے۔ انہیں جھیلوں کے باعث ریتھم مشہور ہے۔ یہاں مَیں نے گرمی کے طویل اور چمکیلے دن بسر کئے۔ اور کالج، محنت اور شہری شور وشغب کے تمام خیالات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس گاؤں میں ہمیں بیرونی دُنیا کے واقعات یعنی جنگ صلح اور عمرانی جدوجہد کی دھیمی سی گونج سُنائی دیا کرتی تھی۔

ہمیں الکاہل اُقصےٰ، ظالمانہ اور فضول جنگ وجدال کا علم ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرمایہ اور محنت کے مابین ایک زبردست کشمکش جاری ہے۔ ہم جانتی تھیں کہ ہماری اس بہشت کی سرحد سے پرے کئی انسان اپنی محنت کے پسینے سے نئی تاریخ کی بنا رہے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے، تو عیش وآرام سے اپنی تعطیل منا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے ان چیزوں کی مطلق پروا نہیں کی۔ ہم نے خیال کیا۔ کہ یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہیگا۔ اور یہ چیزیں سب معدوم ہو جائینگی لیکن ہمارے آس پاس جنگل، اور جھیلوں میں وسیع سُورج مکھی والے درخت ہیں۔ جیسے تاروں بھرا آسمان، خوشبودار چراگاہیں ہیں۔ اور یہ اشیا ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں۔ پس سردست ہمیں انہیں سے حظ اُٹھانا چاہیئے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہماری تمام حسیات آنکھ یا کان ہی کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس امر سے تعجب ظاہر کیا ہے۔ کہ مَیں کیونکر شہر کے بازاروں اور دیہاتی سڑکوں کے درمیان فرق معلوم کرلیتی ہوں اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ مَیں فرش کی عدم موجودگی کا بھی پتہ لگالیتی ہوں۔ یہ لوگ اس امر کو فراموش کردیتے ہیں، کہ اردگرد کے

حالات معلوم کرنے کے لئے میرا تمام جسم چوکنا ہے شہر کی گڑگڑاہٹ اور اس کے شور کو میرے چہرے کی اعصاب محسوس کر لیتی ہیں۔ اور ایک ان دیکھے گروہ کی لگاتار نقل و حرکت کا مجھے برابر احساس ہوتا رہتا ہے۔ اس بے سری بھنبھناہٹ سے میری رُوح آزردہ ہونے لگتی ہے۔ بھاری بھرکم گاڑیوں کا پتھریلے بازاروں میں گونجتے ہُوئے گزرنا اور مشینوں کی یکساں کھڑکھڑاہٹ، یہ تمام اس صورت میں میری اعصاب کے لئے تکلیف دہ چیزیں ہیں۔ جبکہ میری توجہ اس منظرِ وسیع سے جو شور بدہ بازاروں میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے منعطف نہ ہو جو چشم بینا رکھتے ہیں۔

ہمیں دیہات میں قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہاں ہماری رُوح اس بے رحمی کی کشمکش سے آزردہ نہیں ہوتی۔ جو ایک گنجان شہر میں محض زندگی کو قائم رکھنے کی جدوجہد سے پیدا ہوتی ہے، مَیں متعدد مرتبہ ان تنگ و تار، غلیظ شہری گلی کوچوں میں گئی ہوں۔ جہاں غربا بود و باش رکھتے ہیں۔ اور مجھے اس خیال سے سخت برہمی اور جوش پیدا ہوتا ہے۔ کہ امراء تو عمدہ عمدہ مکانات میں رہ کر مضبوط، توانا اور خوبرو ہو جائیں۔ اور غریب لوگ بدنما کوٹھڑیوں میں جہاں دُھوپ ہی نہیں پہنچتی، زندگی بسر کر کے بدصورت اور مُرجھائے ہُوئے کُبڑے بدن والے انسان بنیں۔ جو بچے ان غلیظ گلی کوچوں میں نیم برہنگی اور نیم گرسنگی کی حالت میں پرورش پاتے ہیں۔ وہ ہمارے ہاتھ ان کی طرف پھیلانے سے ایسے خوفزدہ ہو کر دور بھاگتے ہیں، جیسے کوئی کسی صدمے سے بچنے کے لئے اپنی حفاظت کرے۔ اس ننھی اور پیاری مخلوق کو میں اپنے دل میں جگہ دیتی ہوں۔ اور مجھے ان کے خیال سے بار بار دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ اسی آبادی میں بعض مرد اور عورتیں بھی ایسی موجود ہیں۔ جو ایسی گزران کرنے سے بے ڈول اور بدنما شکل کی ہو گئی ہیں۔ مَیں نے ان کے سخت اور کھُردرے ہاتھوں کو چھُو کر اندازہ کیا ہے کہ ان کی جہدِ بقا کسقدر لگاتار اور مسلسل ہے۔ اور وہ کشمکش کا ایک ایسا سلسلہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ کچھ نہ کچھ کام حاصل کرنے کے لئے ان کی کوشش میں بار بار مزاحمت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوشش اور مواقع زِیست کے مابین ان کی زندگی ایک وسیع ناموافقت کی صورت میں بسر ہو رہی ہے۔ ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہوا اور سورج ہر ذی رُوح کے لئے خدائے تعالےٰ کے مفت تحفے ہیں۔ لیکن کیا درحقیقت یہ قول صحیح سمجھنا چاہیئے؟ دیکھو! اس گنجان شہر کے تیرہ و تار کوچوں میں سُورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اور وہاں ہوا غلیظ ہے۔ اے انسان! تو ایک غریب بھائی کو دیکھ کر جو نانِ شبینہ کو محتاج ہے کیسے اُسے بھُول جاتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے۔ پھر تُو کس مُنہ سے یہ دُعا مانگا کرتا ہے! اے کاش کہ

انسان شہر اس کی شان و شوکت، عظمت اور اس کے سیم و زر پر لات مار کر جنگل اور کھیت میں سادہ دیانتداری کی زندگی بسر کرے! اسی صورت میں انسانی بچے، شاندار درختوں کی سی عظیم الشان نشو و نما اور زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان کے خیالات میں بھی راستے پر اُگے ہوئے پھولوں کی سی تازگی اور شگفتگی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے شہر میں سال بھر کام کرنے کے بعد جب میں دیہات کی طرف لوٹتی ہوں تو مقابلہ کرنے سے یہ ناممکن ہے کہ مجھے اس قسم کے خیالات دل میں پیدا نہ ہوں۔ جو میں نے ظاہر کئے ہیں۔

دیہات میں آکر نرم لچکدار زمین کو پاؤں تلے محسوس کرنا، گھاس دار سڑکوں پر چلکر، خار دار کناروں والی ندیوں تک پہنچنا، جہاں میں ندی کے سریلے آبشار میں اپنی انگلیوں کو غسل کراتی ہوں۔ یا کسی پتھر یلی دیوار پر چڑھکر ان سبز کھیتوں میں اترنا، جو دور تک لڑکھڑاتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ پھر دوبارہ سرکشانہ کھلکھلاہٹ کے ساتھ اس دیوار پر چڑھنا، اس تمام شغل میں مجھے کتنا لطف بے بہا حاصل ہوتا ہے!

فرصت کی سیر سے دوسرے درجے پر مجھے اپنے اگل پچھل بائیسکل پر چکر لگانے میں حظ آتا ہے۔ اس آہنی گھوڑے کی لچکدار حرکت کو محسوس کرنا جبکہ ہوا میرے چہرے پر تھپیڑے مار رہی ہو۔ مجھے بہت ہی پر لطف معلوم ہوتا ہے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ گزرنے سے قوت اور بہاؤ کی ایک خوشگوار حس پیدا ہوتی ہے۔ اور اس ورزش سے میری نبض میں رقص اور میری روح میں وجد پیدا ہوتا ہے۔ پیدل یا کشتی کی سیر یا سواری کرتے وقت حتی الامکان میرا کتا میرے ساتھ جاتا ہے۔ مجھے کئی اقسام کے کتوں کا بہت شوق رہا ہے۔ مثلاً سگانِ جہازی، نرم نگاہ والے پشم دار سپنیل، جنگل صفت، شکار کے قریب پہنچکر بیٹھ جانے والے اور وفادار بلند قامت سانڈ نما ٹیریر کتے۔ اس وقت اسی آخری قسم کا ایک کتا میرے پاس موجود ہے۔ جسے میں بہت پیار کرتی ہوں۔ یہ کتا بہت خاندانی ہے۔ اس کی دم خمدار ہے اور اس کی ایک سگانہ خصوصیت یہ ہے کہ وہ عجیب "فز" "فز" کی آواز نکالتا ہے۔ میں نے اس کا نام بھی "فز" رکھدیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرے یہ دوست، میری معذوریوں کو سمجھتے ہیں۔ اور ہمیشہ مجھے تنہا پا کر میرے قریب رہتے ہیں۔ میں ان کے محبت والے اطوار اور ان کی دم کی پُرمعنی حرکت کو بہت پسند کرتی ہوں۔

جب بارش کے دنوں میں مجھے گھر سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔ تو میں دوسری لڑکیوں کی مانند اپنی تفریح میں مشغول رہتی ہوں۔ سالا مرواتی کے طریق سے جو خود مجھے مرغوب ہے۔ ادھر اُدھر سے کسی کتاب کی کوئی ایک آدھ سطر پڑھ لیتی ہوں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو میں کسی دوست کے ساتھ شطرنج کی ایک دو بازیاں کھیلتی ہوں۔ اس قسم کی کھیلوں

کے لئے میرا ایک خاص تختہ بنا ہوا تھا۔ جس میں مربعہ دار خانے کھود کر بنائے گئے تھے۔ تاکہ مُہرے ان کے اندر مضبوطی سے جمے رہیں۔ سیاہ مُہرے اُوپر سے چپٹے ہیں۔ اور سفید خمدار ہیں۔ ہر مُہرے کے وسط میں ایک سوراخ ہے۔ اس سوراخ کے اندر پیتل کی ایک نکمہ نما سلاخ اس غرض کے لئے ڈال دی جاتی ہے۔ کہ بادشاہ کو دوسرے مہروں سے تمیز کیا جائے۔ مُہرے دو علیحدہ علیحدہ قدوقامت کے بنے ہُوتے ہیں۔ یعنی سفید مہرے سیاہ مہروں سے بڑے ہیں۔ پس ایک چال کے بعد مَیں اپنا ہاتھ آہستگی سے تختے پر پھیرتی ہوں۔ جس سے اپنے مدِمقابل کی تمام تدابیر جنگ کو معلوم کرنے میں مجھے ذرا دِقّت پیش نہیں آتی۔

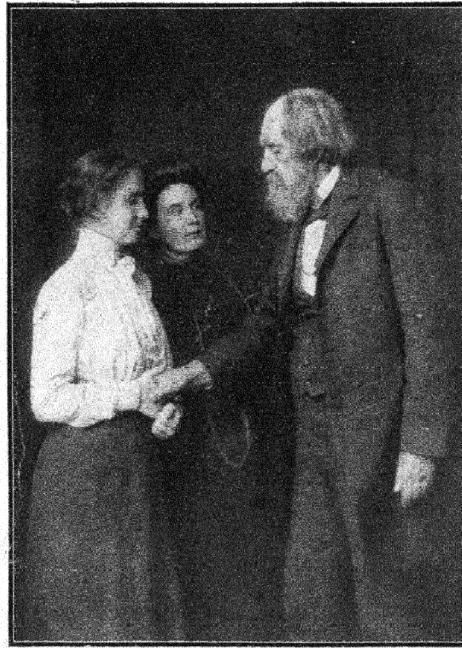
اگر مَیں بالکل تنہا بیٹھی رہوں یا مَیں سست مزاج ہوں تو مَیں اکیلی بیٹھ کر تاش کی کھیل سولی ٹیر کھیلتی ہوں اس کھیل میں میرے پاس ایسے تاش کے پتّے ہیں جن میں ہر ایک کے بالائی داہنے کونے پر بریل کے نشانات ہیں یہ نشانات پتّے کی مالیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اگر میرے اردگرد بچّے موجود ہوں تو مجھے اس سے زیادہ اور کسی چیز سے اتنی تفریح حاصل نہیں ہوتی کہ میں انکے ساتھ کھیل کھلاڑی کروں، مجھے ننھّے سے ننھّا بچہ بھی ایک اعلےٰ درجے کا رفیق معلوم ہوتا ہے۔ اور مَیں یہ بیان کرکے خوش ہوں کہ بالعموم بچّے مجھ سے رغبت کرتے ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں اور مجھے وہ اشیاء دکھاتے ہیں۔ جن سے مجھے دلچسپی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ چھوٹے رفقا میری اُنگلیوں پر اپنے خیالات کو ہجّا کرکے ظاہر کرسکتے۔ لیکن مَیں ان کا مافی الضمیر ان کے لبوں کی حرکت سے پالیتی ہوں۔ اگر مجھے اس میں ناکامی ہو تو وہ اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔ بعض اوقات جبکہ میں ان اشاروں کے سمجھنے میں غلطی کرتی ہوں اور مجھ سے کوئی غلط حرکت سرزد ہوتی ہے۔ تو اس پر بچّوں کا ایک فرمائشی قہقہہ اُڑتا ہے۔ اور سب طرف سے اشارے شروع ہو جاتے ہیں۔ مَیں اکثر انہیں کہانیاں سُناتی ہوں یا کوئی کھیل سکھاتی ہوں۔ جس سے وقت کٹ جاتا ہے۔ اور ہم خوشی خوشی ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ہیں۔

میرے لئے عجائب خانہ اور ذخائرِ فنون بھی بہت سی مسرّت اور واقفیّت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ بیشک یہ امر اکثر لوگوں کے لئے باعثِ تعجب ہوگا۔ کہ وہ ہاتھ جو بینائی کی امداد سے محروم ہے کس طرح بے جان مرمری نمونوں میں حُسن اور قوتِ عمل کا احساس کرسکتا ہوگا؟ بایں ہمہ یہ صحیح ہے کہ مَیں بڑی بڑی مصنوعات کو چھو کر ان سے خالص مسرت حاصل کرتی ہوں۔ جب میری اُنگلیاں کسی صنعتی نمونے کے خطوطِ مستقیم اور منحنی کو گردش کرکے دریافت کرتی ہیں۔ تو وہ صنّاع کے اُن خیالات اور محسوسات کا پتہ لگا لیتی ہوں۔ جو اس نے نمونے میں ظاہر کئے ہیں۔ مَیں دیوتاؤں اور بہادروں کے



مس کیلر ابھرے ہوئے حروف والی کتاب پڑھ رہی ہے



مس کیلر مس سلیون اور ڈاکٹر ایڈورڈ ایورٹ ہل



ہیلن کیلر اور مس سلیون



مس کیلر اور مارک ٹوین

چہروں پر نفرت، شجاعت اور محبت کے اظہار کو محسوس کر لیتی ہوں۔ بعینہٖ جیسے مَیں ان اظہارات کو زندہ چہروں سے معلوم کر سکتی ہوں جنہیں چھونے کا مجھ کو موقع ملتا ہے۔ مَیں روما کی شکاری دیوی ڈاینا کی نشست سے جو اس کے نمونے میں دکھائی گئی ہے۔ جنگل کے حسن اور آزادی اور اُس رُوح کو دیکھ سکتی ہوں۔ جو پہاڑوں اور شیروں کو سدھا کر تند سے تند جذبات کو مطیع اور مغلوب کر لیتی تھی۔ مَیں حسن کی دیوی وینس کے پُرسکون اور ملائم خطوطِ سحنی کے ذریعے اپنی رُوح کو مسرت اندوز کر سکتی ہوں۔ اور باری کے تیار کردہ، پیتل کے مجسموں سے مجھ پر جنگل کے اسرار ہویدا ہوتے ہیں۔

میرے مطالعہ کے کمرے میں یونانی نابینا شاعر ہومر کی ابھری ہوئی نغمہ نما تصویر لٹک رہی ہے۔ وہ اتنی نیچے ہے کہ اس پر میرا ہاتھ سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے مَیں اس خوشنما تصویر کے افسردہ چہرے کو محبت آمیز احترام کے ساتھ چھوتی ہوں۔ مَیں اس کی رعب دار بھووں کے ہر ایک خط سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ زندگی کے ایسے خطوط ہیں جو رنج و الم اور کشمکش حیات کی تلخی کی شہادت دیتے ہیں اس کی وہ بے نور آنکھیں، ایک بے جان مسالہ میں سے اپنے محبوب ملک یونان کے نیلگوں اور روشن آسمان کو بیفایدہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ کیونکہ وہ آسمان انہیں دکھائی نہیں دے سکتا۔ اس کے خوشنما مُنہ سے رُوح کی مضبوطی، صداقت اور ملائمت ٹپکتی ہے۔ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔ جو رنج و الم کا لذت آشنا ہے۔ مَیں اس محرومیٔ نظر کو اور اس دائمی شبانہ تاریکی کو جس میں اس کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ بخوبی سمجھ سکتی ہوں۔ دوپہر کی بھرپور روشنی میں اس پر ایک تاریکی کا عالم طاری ہے بقول محروم ع

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

یہ وہ تاریکی ہے کہ جس کا کوئی علاج ہی نہیں۔ یہ سُورج کے کامل گرہن کا سا سماں ہے۔ جس میں دن کی روشنی نظر آنے کی کوئی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔

مَیں عالم خیال میں ہومر کو اس حالت میں گیت گاتے سُن سکتی ہوں۔ جبکہ متامل اور متزلزل چال کے ساتھ وہ ایک یونانی کیمپ سے دوسرے کیمپ تک اپنا راستہ ٹٹولتا جاتا ہے۔ زندگی، محبت، جنگ اور ایک شریف یونانی قوم کی شاندار فتوحات کے راگ اس کے وردِ زبان ہیں یہ ایک حیرت انگیز شاندار نظم تھی۔ جس کی طفیل اس نابینا شاعر کو ایک غیرفانی عظمت کا تاج پہنایا گیا۔ اور تمام زمانوں میں اس کے کلام کی مدح و ثنا کی گئی۔

مَیں بعض اوقات حیران ہو کر یہ سوچا کرتی ہوں کہ معلوم نہیں فن سنگ تراشی کی خوبیوں کو پرکھنے کے لئے انسانی ہاتھ زیادہ کام کر سکتا ہے یا آنکھ، میرا خیال ہے کہ مجسموں کے

خطوط مستقیم اور منحنی کے کیفیت آفرین بہاؤ کو دیکھنے کی بجائے ٹٹولنے کے ذریعے سے، زیادہ باریکی کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خواہ کچھ بھی ہو مَیں اتنا جانتی ہوں کہ مَیں قدیم یونانیوں کے دلوں کی حرکات کو ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کے مرمری مجسموں کے ذریعے سے بخوبی محسوس کرتی ہوں۔

ایک اور مسرت جو دوسری خوشیوں کے مقابلے میں مجھے شاذونادر حاصل ہوتی ہے۔ تھیئٹر[۵۱] میں جانا ہے مَیں کسی ناٹک سے جبکہ اس کا کھیل ہو رہا ہو۔ اور مجھے اس کا پلاٹ بتایا جا رہا ہو۔ پڑھنے کی بہ نسبت اس کا زیادہ حظ اٹھاتی ہوں کیونکہ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مَیں ہنگامہ خیز حالات میں زندگی بسر کر رہی ہوں۔ مجھے بعض بہت بڑے بڑے ایکٹروں سے ملاقات کرنے کا فخر حاصل ہوا ہے۔ جو ملنے والوں پر ایسا جادو کر دیتے ہیں کہ انہیں موجودہ حالات اور جگہ کا کوئی ہوش نہیں رہتا۔ اور وہ گزشتہ زمانے کے افسانوں ہی میں محو ہو جاتے ہیں۔ مجھے مشہور مس ایلن ٹیری[۵۲] کے چہرے اور لباس کو ٹٹولنے کی اس وقت اجازت دی گئی تھی۔ جبکہ وہ سٹیج پر ملکہ بنی کھڑی تھی۔ اور اس کے سراپا سے ایسا جاہ و جلال ٹپکتا تھا۔ جس کے گرداگرد پُرعظمت رنج و ملال کا ہالہ معلوم ہوتا تھا۔ اسکے قریب سر ہنری آرونگ[۵۳] بادشاہ کے روپ میں کھڑا تھا۔ اس کے ہر اشارے اور حرکت سے فہم و فراست کی عظمت اور اس کے نازک چہرے میں جس سے رنج و الم کوسوں دور تھا جو در اصل بناوٹی تھا۔ ایک شگفتگی پائی جاتی تھی جسے میں کبھی فراموش نہیں کروں گی۔

مجھے مشہور ایکٹر مسٹر جیفرسن سے بھی نیاز حاصل ہے اور مَیں انہیں اپنے احباب میں سے تصوّر کرتی ہوں جہاں کہیں

[۵۱] ہندوستان میں تھیئٹر کی سیر اور ناٹک دیکھنا بے حد مذموم خیال کیا جاتا ہے لیکن یورپ اور امریکہ میں یہ ایک معزز فن کہلاتا ہے۔ جہاں اعلیٰ تماشا گروں کا ایک ایک شب کا معاوضہ کئی کئی ہزار پونڈ ہوتا ہے۔ اور ان میں سے بعض کو اپنے کمال کے عوض حکومت کی طرف سے اعلیٰ خطاب ملتے ہیں۔ سر ہنری ارونگ سر بیر بھوم ٹری وغیرہ بہت پائے کے ایکٹر گزرے ہیں۔ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مشرق بالخصوص ہندوستان کی سرزمین روحانیت سے مالامال ہے۔ اس لئے ایسے مشاغل کی یہاں وقعت نہیں ہو سکتی (مترجم)

[۵۲] تاریخ پیدائش ۱۸۴۸ء نامور انگریزی ایکٹرس، ۸ سال کی عمر میں سٹیج پر آئی۔ بعد ازاں لندن کے مشہور تھیئٹر لائی سیم میں کام کرتی رہی۔ (مترجم)

[۵۳] تاریخ پیدائش ۱۸۳۸ء تاریخ وفات ۱۹۰۵ء مشہور انگریزی ایکٹر تھیئٹر کی زندگی ۱۸۶۶ء میں شروع کی۔ بعد ازاں ۱۸۷۸ء میں اس نے اپنا تھیئٹر بنایا۔ شیکسپیئر کے ناٹکوں میں شائیلاک اور ہملٹ کا روپ بھرنے میں بے مثل تھا۔ (مترجم)

مجھے ان کے تماشا کرنے کا علم ہو، مَیں ضرور ان سے جا کر ملاقات کرتی ہوں۔ مجھے ان کا پہلا تماشا دیکھنے کا اتفاق اس وقت ہُوا تھا۔ جبکہ مَیں نیویارک کے مدرسے میں پڑھا کرتی تھی۔ اُنہوں نے ایک ناول کے کیرکٹر رپ وان ونکل[51] کا سوانگ بھرا ہُوا تھا۔ مَیں اس افسانے کو بارہا پڑھ چکی تھی۔ لیکن مجھے رپ کے دھیمے عجیب و غریب رحیمانہ اطوار کبھی ایسے بھلے معلوم نہیں ہُوتے۔ جیسے اس ناٹک کو دیکھنے سے۔ کیونکہ مسٹر جیفرسن کا خوشنما روپ اتنا مؤثر تھا کہ میں فرطِ مسرت سے بے خود ہوگئی۔ اور میری اُنگلیوں میں بُڈھے رپ کا ایسا نقشہ کھنچ گیا جو کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ کھیل ختم ہونے پر مسز سلیون صاحبہ مجھے سٹیج کے پیچھے ان سے ملاقات کرانے لے گئیں۔ اور مَیں نے ان کے عجیب و غریب لباس اور ان کے مصنوعی بالوں اور داڑھی کو ٹٹولنا شروع کیا۔ مسٹر جیفرسن نے مجھے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی اجازت دی۔ پس مَیں تصوّر کر سکتی تھی۔ کہ بیس سال کی نیند کے بعد بیدار ہو کر رپ کا کیا حلیہ ہوگا۔ اور وہ چونک کر کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہوگا۔ یہ سب مسٹر جیفرسن نے نقل کر کے بتایا

مَیں نے ان کو رقیب[52] کے ناٹک میں بھی کھیل دکھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ جبکہ مَیں بوسٹن میں انکی ملاقات کے لئے گئی۔ تو اُنہوں نے مجھے رقیب کا نہایت عجیب تماشا کر کے دکھایا۔ یعنی وہ اور ان کا فرزند ایک بڑی میز پر بیٹھ گئے۔ اور ان کے بیٹے نے بوب ایکٹرز کی حیثیت سے پیغامِ جنگ تحریر کرنا شروع کیا۔ مَیں ان کی تمام حرکات کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کرتی رہی۔ اور انکی دانستہ اور مضحکہ انگیز غلطیوں، اشاروں اور حرکات کو اسقدر بخوبی سمجھتی رہی کہ اگر وہ مجھے ہجا کر کے بتائی جائیں تو انہیں سمجھنا ناممکن ہوتا۔ اس کے بعد دونوں رقیب آپس میں جنگ کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اور مَیں ان کی تلواروں کے چابکدستی کے وار اور بچاؤ کی حرکات اور غریب بوب ایکٹرز کے تردّد اور پس و پیش کرنے کو سمجھ گئی۔ جبکہ اس نے کہا کہ "اب تو شجاعت میری اُنگلیوں کے سروں میں سے ٹپکنے لگی ہے۔" اس کے بعد اس بڑے تماشا گر نے اپنے کوٹ کو ایک جھٹکا دیا۔ اور

[51] واشنگٹن ارونگ، امریکن مورخ کی تصنیف ہے جس میں رپ وان ونکل ایک دلندیزی امریکن ہیرو ہے۔ سیر کرتا کرتا وہ کسی ایسی مجلس میں جا پہنچتا ہے۔ جو پہاڑ کے دامن میں مصروف مے نوشی ہے۔ رپ بھی شراب پیتا ہے جس سے اس پر نیند کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ بیس سال تک سویا رہتا ہے۔ اسکے بعد بیدار ہوتا ہے تو اسے امریکہ کی دُنیا ہی نئی نظر آتی ہے۔ اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ملک ایک خود مختار ریاستوں کا مجموعہ ہے۔

[52] انگریزی ڈراما نویس شیریڈن کا ناٹک ہے۔ (مترجم)

ایسا سماں بنایا کہ لحظہ بھر میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں فالنگ واٹر کے گاؤں میں پہنچ گئی ہوں۔ اور شنڈر کا گھنگھریالے بالوں والا سر میرے زانو کے ساتھ ٹکرا رہا ہے۔ مسٹر جیفرسن نے رپ وان ونکل کے بہترین سوال و جواب سُنائے جن میں اگر ایک طرف مسکراہٹ تھی تو دوسری طرف آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے مجھ سے ان حرکات و سکنات کو ظاہر کرنے کے متعلق استدعا کی جو ان اشعار کے ساتھ ہونی چاہئے تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے ناٹک کی حرکات کا تو مطلق کوئی علم نہیں تھا۔ پس میں اٹکل کیساتھ محض قیاسی اشارے اور کنائے کر سکتی تھی۔ لیکن اپنے کمال اور فن سے اس شخص نے قول کو فعل کے مطابق کر دکھایا۔ رپ کا سرد آہ بھر کر یہ کہنا "کیا دُنیا ایک شخص کو اس کی روانگی کے بعد اس قدر جلد فراموش کر دیا کرتی ہے؟" اس کا وُہ خوف و ہراس جس کے ساتھ وہ نیند سے چونک کر اپنی بندوق اور کُتّے کو تلاش کرتا ہے۔ اور اس کا وہ ظریفانہ عدم استقلال جو وہ ایک اور شخص مسمی ڈیرک کے ساتھ عہدنامہ کرتے وقت ظاہر کرتا ہے۔ یہ تمام حرکات اصلی زندگی سے بہت دُور دکھائی دیتی ہیں۔ میری مراد اصلی زندگی سے وہ زندگی ہے جس میں تمام واقعات ہماری مطلوبہ توقعات کے بموجب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

مجھے اپنا پہلی مرتبہ تھیٹر میں جانا بخوبی یاد ہے۔

اس واقعہ کو بارہ سال گزر چکے ہیں۔ اس وقت ایک چھوٹی سی ایکٹرس مسمی ایلزی لیزلی بوسٹن میں مقیم تھی۔ اور مس سلیوان صاحبہ مجھے "شہزادہ اور گداگر" کے تماشے میں اس کا کھیل دکھانے کے لئے لے گئی تھیں۔ مجھے رنج و مسرت کی وُہ متبادل کیفیات کبھی نہیں بھولیں گی۔ جو اس ننھے سے پُرلطف تماشے میں سر بسر چل رہی تھیں۔ میں اس تعجب خیز بچی کو فراموش نہیں کر سکتی جو اس کھیل میں تماشا دکھا رہی تھی۔ کھیل ختم ہونے پر مجھے اس تماشاگاہ کی پشت کی طرف جانے کی اجازت دی گئی۔ جہاں میں نے اس ننھی ایکٹرس سے مع اس کی شاہانہ پوشاک کے ملاقات کی۔ ایلزی سے بڑھ کر کوئی پیارا اور قابلِ اُنس بچہ ملنا مشکل ہے۔ اس کے سُنہری بال اس کے شانوں پر بادل کی طرح لہرا رہے تھے۔ وہ مُسکرا رہی تھی۔ تکان یا شرمیلے پن کی کوئی علامت اس سے ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بہت بڑی مجلس کے روبرو اپنا کھیل دکھا رہی تھی۔ اس زمانے میں میں نے ابھی ابھی بولنا سیکھا تھا۔ اور اس سے قبل اس کا نام بار بار زبان پر لا چکی تھی۔ حتیٰ کہ میں اُسے بخوبی بولکر بتا سکتی تھی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جبکہ اُس نے میرے وہ چند الفاظ سمجھ لئے۔ جن کے ساتھ میں نے اس سے خطاب کیا تھا۔ پس اس نے بلا تامّل اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔

اے ناظرینِ کرام! کیا اب یہ حقیقت آپ پر واضح نہیں ہوگئی۔ کہ باوجود اپنی تمام معذوریوں کے میری زندگی اس حسین دُنیا کے بہت سے مشاغل میں مصروفِ کار رہتی ہے؟ یاد رہے کہ دُنیا میں ہر شے اپنے نوا در رکھتی ہے۔ حتےٰ کہ تاریکی اور خاموشی میں بھی ایک عجیب اثر ہے۔ اور مَیں ہر حال میں اس اثر سے قناعت کا سبق سیکھتی ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات جب کہ مَیں عالمِ تنہائی میں بیٹھی ہُوئی زندگی کے ان دروازوں (آنکھوں) سے کسی نامعلوم چیز کے لئے سراپا انتظار ہوتی ہوں، تو اس وقت مجھے دُنیا سے اپنی علیحدگی کا احساس ہوتا ہے ان دروازوں سے باہر نور، ترنّم اور کسی کی شیریں ہمنشینی کا حظ موجود ہے۔ لیکن میں اس سے محروم ہوں۔ آہ! ایک خاموش، بے رحم قسمت اس درّۂ تاریکی کو عبور کرنے میں میری سدِّ راہ ہے۔ مَیں اس قسمت کے مغرور حکم پر بخوشی چون وچرا کر سکتی ہوں۔ کیونکہ میرا قلب، باوجود تعلیم یافتہ ہونیکے اب بھی جوش اور اکھڑپن کے جذبات سے خالی نہیں لیکن وائے بدنصیبی کہ میری زبان ان تلخ اور بیکار الفاظ کو بولنے سے قاصر ہے۔ جو دل سے اُٹھکر زبان کی طرف آتے ہیں۔ پس وہ الفاظ اُن بہے آنسوؤں کی طرح لوٹ کر پھر دل میں آجاتے ہیں! پھر امید اپنے چہرے پر ایک مُسکراہٹ لئے ہُوئے نمودار ہوتی ہے اور میرے کان میں یہ الفاظ پھونکتی ہے۔" دیکھو! خود فراموشی میں بھی ایک لطف ہے!" پس مَیں کوشش کرتی ہوں کہ اسی روشنی کو اپنا نور قرار دوں۔ جو دوسروں کی آنکھوں میں جلوہ فگن ہے۔ میں اسی موسیقی کو اپنا نغمہ و سرود بناؤں، جو دوسرے لوگوں کے کانوں میں پہنچتی ہے۔ اور دوسروں کے لبوں کے تبسّم ہی سے اپنی راحت کا سامان بہم پہنچاؤں۔

(باقی آئندہ)

خادم محی الدین

گلکاریِ داماں

(۱)

کوئی تدبیرِ ملاقات جہاں بھر میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں ترا وصل مقدر میں نہیں

بے سبب آج پریشانیِ خاطر کیوں ہے
اور کیا بات ہے سودا جو کوئی سر میں نہیں

یہ شبِ ہجر کی حالت ہے الٰہی توبہ
روشنی آج کہیں دیدۂ اختر میں نہیں

پوچھ گلکاریِ داماں کی حقیقت مجھ سے
یہ ہیں وہ نقش جو بُت خانۂ آذر میں نہیں

تیری اُتری ہُوئی پوشاک میں پائی ہم نے
وہ لطافت جو کسی حور کے پیکر میں نہیں

لوگ کیوں چاند کو بدنام کیا کرتے ہیں
اس میں کیا ہے جو ترے چہرۂ انور میں نہیں

کیا دلآویز ہے ساقی کے تغافل کی بہار
لطف جو حسرتِ ساغر میں ہے ساغر میں نہیں

(۲)

ابھی سے ہے مصیبت پر مصیبت دیکھئے کیا ہو
یہ ہے آغاز تو انجامِ اُلفت دیکھئے کیا ہو

خُدا جانے نظر ٹھہرے نہ ٹھہرے روئے رنگیں پر
بہارِ حسن کا رنگِ لطافت دیکھئے کیا ہو

وصالِ یار میں دل کو سکوں حاصل نہیں ہوتا
یہ عالم ہے تو رنگِ شامِ فرقت دیکھئے کیا ہو

جلال الدین اکبر

کیفیات

دلِ محزوں یہی ہوگا شبِ غم کی سحر ہوکر
امیدیں تیری مٹ جائیں گی مایوسِ اثر ہوکر

کوئی تاثیر تو دیکھے مرے سوزِ محبت کی
رہی دامانِ شب میں آہ تصویرِ سحر ہوکر

نہ ہو احساس یارب اپنی بے برگ و نوائی کا
گزر جاؤں میں راہِ زندگی سے بے خبر ہوکر

بھروسا تھا مجھے پائے تمنا کی جو ہمت پر
پھرا دشتِ بلا میں آپ اپنا راہبر ہوکر

خدا ایسا کرے میری دعائے بیکسی اک دن
اتر جائے ترے سینے میں تصویرِ اثر ہوکر

نہ آجائیں وہ یارب وقتِ آخر میری بالیں پر
نہ رہ جائے کہیں دنیا سے سامانِ سفر ہوکر

جہانِ غم کے سب جھگڑے تھے بس اک آہِ سوزاں تک
ہوا کیا ختم قصہ زندگی کا مختصر ہوکر

مجھے تو کنجِ تنہائی کی عادت ہوگئی یارب
نہیں معلوم کیا ہوگا قفس میں بال و پر ہوکر

مرے پائے طلب کا جوشِ ہمت خوب کام آیا
رہیں ناکامیاں بھی ساتھ سامانِ سفر ہوکر

سماں ہی تھا کچھ ایسا بیخودی کا اس کی محفل میں
کہ میری بیقراری کھوگئی شوقِ نظر ہوکر

تمہارے حسن کے صدقے میں دامن اسکا بھر جاتے
نگاہِ شوق اٹھی ہے مری دریوزہ گر ہوکر

گھٹیں دل میں عجب صورت سے امیدیں رہائی کی
بڑھا انسِ قفس یعنی خیالِ بال و پر ہوکر

شعاعیں آہِ آتشبار کی قائم نہیں رہتیں
شبِ فرقت میں مٹ جاتی ہیں آثارِ سحر ہوکر

بھروسا بسکہ ہے جوشِ توقع پر محبت میں
مرے دل میں رہیگا طولِ غم بھی مختصر ہوکر

میں ان کو دیکھ کر رونے لگا جوشِ طبیعت سے
تمنائیں مری نکلیں فریبِ چشمِ تر ہوکر

شبِ غم کی مصیبت کٹ بھی جائیگی مگر ہادی
مرا بچنا بہت مشکل ہے مایوسِ سحر ہوکر

ہادی مچھلی شہری

تخیّلات

ٹھکانے لگ گئی محنت جنونِ فتنہ ساماں کی
کفن کے کام آئیں دھجیاں میرے گریباں کی

بلائے جاں ہُوا میرے لئے ذوقِ نمکپاشی
مناؤں خیر اب زخموں کی یا ان کے نمکداں کی

نکلنا جیتے جی مشکل ہے اے ناوک فگن اس کا
کہ اب گھل مل گئی دل کے لہو میں نوک پیکاں کی

تہ و بالا کئے دیتی ہیں دنیائے تمنّا کو
وہ طوفاں خیز ہیں موجیں تبسّم ہائے پنہاں کی

تغافل چھوڑ دے ظالم کہ اب ہر دم ضرورت ہے
مری ایذا پسندی کو ترے جورِ نمایاں کی

ترا وحشی نئی صورت کی زنجیریں بناتا ہے
بٹا کرتا ہے بیٹھا دھجیاں اپنے گریباں کی

مری آزادیاں پابندیوں پر جان دیتی ہیں
پھرا کرتی ہے آنکھوں میں مری تصویر زنداں کی

لہو کھنچ کھنچ کے ہر عضوِ بدن کا آگیا دل میں
تواضع ہو سکی پھر بھی نہ ان کے تیرِ مژگاں کی

کسی کے اعتبارِ وعدۂ فردا پہ مرتا ہوں
یہ کہتے کہتے نبضیں چھٹ گئیں بیمارِ ہجراں کی

گری ہیں نجد کے دامن میں جاکر کیا ٹھکانہ ہے
کہاں پہنچی ہیں اُڑ کر دھجیاں میرے گریباں کی

مآلِ سوزِ فرقت ہے دلیلِ راہِ الفت ہے
اندھیرے میں لئے بیٹھا ہوں مشعل داغِ ہجراں کی

کرونگا اعتبارِ بدگمانی اب نہ جیتے جی
قسم ہے آج سے مجھ کو ترے عہدِ پشیماں کی

نکلتی ہیں مری ہر آہ سے چنگاریاں بسملؔ
جلائے ڈالتی ہیں دل کو لپٹیں سوزِ پنہاں کی

حکیم عبدالعلی خاں بسملؔ (فرخ آبادی)
تلمیذ حضرت ہادی (مچھلی شہری)

خوشی کے چند لمحے

دُنیا کی بعض عمارتیں ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہیں اور بعض ہم میں ایک پُر لطف احساس پیدا کرتی ہیں۔ غار ہائے اجنٹا میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ یہ قدیم عبادت گاہ اپنی سنگ تراشی، نقاشی اور تاریخی عظمت کے لحاظ سے جو عالمگیر شہرت رکھتی ہے وہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ یہ غار دُنیا کے ان چند بے نظیر اور غیر فانی آثار میں ہیں، جو زائرین کے دل و دماغ کو مسحور کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور دُنیا کے سیاحوں کی چشم بصیرت کے سامنے بنانے والوں کی عظمت اور ان کے قومی تمدن و تہذیب کا بہترین دلپذیر ترین ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے اہلِ ذوق میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان غاروں کے قدرتی منظر کی نیرنگی و دلپذیری سے تو کُجا خود ان کی جائے وقوع سے واقف ہوں۔ دو متوازی پہاڑوں کا سلسلہ حسینانِ عالم کی زلف کی طرح پیچ و خم دکھاتا ہوا دُور تک چلا گیا ہے۔ اور سیاح کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ یہ پہاڑ ڈھلوان نہیں ہیں۔ بلکہ کسی سر بفلک قلعہ کی کوہ پیکر دیواروں کی طرح ان کی چٹانیں سیدھی کھڑی ہیں۔ اور ان کے درمیان ایک ندی ان کے دامن میں لپٹتی ہُوئی ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ ایک مقام پر یہ دونوں پہاڑ نصف دائرہ کی شکل بنا کر مل گئے ہیں۔ یہی وہ خاموش اور پُر سکون جگہ ہے۔ جس کو دو ہزار برس پیشتر بودھ کے پُجاریوں نے گیان دھیان کے لئے پسند کیا تھا۔ اور جو آج بھی چشم عالم کو اپنے پجاریوں کے زہد و ورع کا نقشہ دکھانے کو موجود ہے۔

یہ حقیقت کدہ جو کسی زمانہ میں صوری و معنوی علوم کا گہوارہ تھا۔ اب تک کسی نہ کسی عنوان اپنے ہر مہمان کی میزبانی کرتا ہے۔ دُور دراز کے تھکے ماندے سیاح کو فرحت، گرمی میں بولائے ہُوئے چرند و درند کو پناہ، پیاس سے بیتاب انسان و حیوان کو صاف چشمہ کا شیریں پانی، نباتات کو غیر معمولی نمو، ارباب تحقیق کو غور و فکر، مذہب کو عقیدہ و ارادہ کا زور، سرکشوں کو عاجزی و نگونساری اور اہلِ دول کو عبرت و فنا کی تعلیم، صنّاعوں مصوروں اور نقاشوں کو چابکدستی کا سبق، شعراء کو تخیّل، آواز کو موسیقی اور گونج، نظر کو کشش، آبِ رواں کو اٹھکیلیاں، پہاڑوں کو سلیقہ، کُرّہ زمین کو فخر، روز روشن کو خوبصورتی اور اندھیری رات کو ہیبت بخشتا ہے۔ اور یہ اسکی فیاضیاں

ایک دو روز کی نہیں، بلکہ دائمی ہیں جنہیں قدرت کے جبروتی ہاتھوں کے سوا اور کوئی نہیں چھین سکتا۔

مَیں کبھی کبھی اس قطعہ ارض کی سیر کو جایا کرتا تھا اور خدا جانے کیوں ہمیشہ اس کی سیر کے لئے دل بے چین رہا کرتا ہے۔ ایک مرتبہ فرداپور سے گھوڑے پر سوار ہو کر اس اُجڑی نگری کی طرف نکل گیا۔ میرے ساتھ ایک دیہیر بھی تھا۔ فرداپور سے غار دو میل کے فاصلہ پر ہیں۔ گو یہ راستہ بہت ناہموار اور دشوار گزار ہے۔ مگر اس کے کنارے کے قدرتی مناظر اس قدر دلچسپ اور دلپذیر ہیں کہ مسافت طے کرنے میں کوئی کلفت نہیں ہوتی۔ دوپہر کا وقت تھا کہ ہم اس پُر فضا گھاٹی کو طے کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ دوران سفر میں میرے ساتھی نے جسے مَیں بالکل جاہل سمجھتا تھا۔ اور اب بھی سمجھتا ہوں کئی بار اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دینا چاہا۔ مگر آخرکار میری بے اعتنائی اور از خود رفتگی دیکھ کر سمجھ گیا۔ کہ مجھے اس کی تاریخی معلومات سے مستفید ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ اور خود اُس کے قریب ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔

مَیں کوئی گھنٹہ بھر غاروں میں پھرتا رہا۔ اس سے پیشتر کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا لیکن کبھی اس پہاڑ کے اُوپر چڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس مرتبہ نہ معلوم کیا جی میں آئی۔ کہ اُوپر چڑھ گیا۔ یہ جگہ سطح زمین سے تقریباً ایکہزار فٹ بلند تھی، پہاڑ کے دونوں طرف پندرہ پندرہ میل تک نظر کام کرتی تھی۔ اور اس تمام دلکشا میدان میں سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ یہ زمردیں فرش کچھ ایسا بھلا معلوم ہوا کہ مجھ پر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اور میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ہوا کے پاکیزہ سرد جھونکوں نے سفر کی خفیف سی تکان کو فرحت و انبساط سے بدل دیا۔ دل میں ایک سرور پیدا ہوا۔ اور اس وقت مَیں خیال کرنے لگا۔ کہ درحقیقت انسانی زندگی کا ہر دن اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے عمرِ عزیز میں شمار کیا جائے، آج کا دن میرے ان چند مسرت بخش دنوں میں سے ایک دن ہے جو اب تک مجھے اپنی تمام عمر میں نصیب ہوئے ہیں۔ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں تھا کہ سامنے لگرونڈوں کے جھنڈ میں سے ایک بوڑھا نمودار ہوا۔ اس پیر فرتوت کا سن کوئی ساٹھ پینسٹھ برس کا ہوگا۔ لیکن قویٰ خاصے مضبوط، جسم توانا، ڈیل ڈول خاصا تندرست جوانوں کا سا اپنے جسم پر ایک پھٹا پُرانا سا کمل اوڑھے ہُوئے تھا۔ داڑھی اور سر کے بال لمبائی میں تقریباً برابر تھے۔ غرض ہیئت مجموعی ایک نہایت عجیب الخلقت انسان نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر ہماری شہری متمدن دُنیا کا کوئی انسان ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص میرے قریب آ گیا۔ مَیں

اس کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس خیال سے کہ شاید مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "کیوں! تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا۔ "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میں جہاں پہنچ جاؤں وہیں جانا چاہتا ہوں۔ میری کوئی خاص منزلِ مقصود نہیں آج میں یونہی تفریح کیلئے اس پہاڑ پر چڑھ آیا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہ اس کے دوسری جانب کیا ہے؟"

پھر اس نے ایک عالمانہ متانت کے لہجہ میں اور ایک خاص اندازِ مسرت سے کہا۔ "یہ دن زندگی میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ یک صبح چمن روزگارے خوشتر"

یہ سُنکر میرے خیالات میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ آج حسنِ اتفاق سے مجھے ایک نادر موقع میسّر آگیا ہے۔ ورنہ ہر روز ایسا نہیں ہوتا۔ کہ کوئی صاحبِ علم اہلِ بصیرت گدڑی میں خوش مل جائے۔ میں اس بوڑھے عالم کو یہاں ایک نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اسی چٹان پر بیٹھ گیا بوڑھا اجنبی بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ اُس نے ایک تھیلی میں سے کچھ گولر نکال کر اپنے سامنے رکھے۔ پھر ہم نے ان مسائل پر گفتگو شروع کی جو عموماً ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتے رہتے ہیں یعنی یہ کہ راحت کہاں اور کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اور رُوح کا انجام کیا ہوگا۔

ان مباحث پر اُس کے خیالات نہایت صحیح، عمیق اور منصفانہ پائے گئے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہُوا:۔

مَیں نے کہا کہ "مَیں بھی آج اس قدر خوش ہُوا ہوں کہ اپنی خوشی کے اظہار کے لئے مجھے کافی الفاظ نہیں ملتے۔ جب مَیں (نیچے کی طرف اشارہ کر کے) ان غاروں کی طرف آرہا تھا۔ تو راستہ کے لطیف مناظر نے میری رُوح میں شعریت پیدا کر دی۔ اور مَیں نے "نشاط" پر ایک نظم لکھنے کا ارادہ کیا۔ بلکہ دو ایک شعر بھی دِل ہی دل میں کہہ لئے۔ لیکن میرے لئے خوش ہونا آسان تھا۔ کیونکہ مَیں گھوڑے پر سوار تھا۔ اور صبح کو بہت عمدہ ناشتہ کر کے روانہ ہُوا تھا۔ مگر پھر بھی مَیں دیکھتا ہوں کہ اس قسم کے دن میرے لئے خواب و خیال ہیں۔ گو مجھے نصیب ضرور ہُوتے ہیں۔ مگر اتنے کہ اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور باقی تمام دنوں سے اسقدر مختلف ہیں کہ مَیں کبھی اُنہیں بھول نہیں سکتا۔"

اجنبی۔ آپ کا آخری جملہ بالکل صحیح ہے۔ آپ کی زندگی کے یہ چند دن معمولی دنوں سے واقعی بالکل مختلف ہیں لیکن آپ کا یہ خیال غالباً صحیح نہیں ہے کہ گھوڑے کی سواری، لذیذ کھانا، ملازم کی ہمرکابی یا اور اسی قسم کے لوازمات ان خوشی کے دنوں سے کچھ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بیشک درست ہے کہ دولت کے نشے میں ہمارے ایام اس طرح گزر جاتے ہیں کہ خبر نہیں ہوتی۔ اور افلاس ان کو

کٹھن اور دشوار بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہُوا کہ افلاس
سے رُوح پر مایوسی طاری ہو گئی ہو۔ وہ لوگ جو خودکشی کرتے
ہیں، نہ دولتمند ہوتے ہیں نہ مفلس، خوشی کے ان قیمتی لمحات
کو دولت نے بہت کم خریدا ہے۔ جو کبھی کبھی مجھے نصیب
ہوتے ہیں۔ حالانکہ (ایک گولر کو آدھا کتر کر) خدا جانتا
ہے۔ مَیں اس وقت ایک حبّہ برابر شے خریدنے کی بھی استطاعت
نہیں رکھتا۔"

مَیں۔" اچھّا تو یہ فرمائیے۔ کہ یہ خوشی کے لمحات کہاں
سے آتے ہیں؟ — اور ایک گولر مجھے بھی عنایت کیجئے۔"

اجنبی۔" بڑی خوشی سے، بلکہ دو لیجئے۔ یہ بالکل پکّے
ہیں۔ ہاں تو آپ کے دوسرے سوال کا جواب میرے
خیال میں جنّت کا دروازہ وقتاً فوقتاً کسی قدر کھل جاتا ہے
اور اس کھُلنے اور بند ہونے کے دوران میں بہشتی ہوا کا
کوئی جھونکا باہر آجاتا ہے۔" یہ جملہ اس نے ایک متانت آمیز
انداز میں کہا۔ اُس کی آنکھیں احساس مسرت سے چمک
اُٹھی تھیں۔ اور اس کی سفید داڑھی کے بال ہوا سے اُڑ
رہے تھے۔ پھر اُس نے کہا۔" وہ شخص جو کسی بڑے شہر
میں کسی دولتمند کا غلام ہے۔ اگرچہ نہایت بدنصیب
انسان ہے۔ مگر یہ خوشی کے لمحات اس حریص دولتمند کو
بھی کبھی کبھی مل جاتے ہیں۔ جس کے چہرہ پر ہر وقت کی
پریشانی اور تشویش نے جھُریاں ڈال دی ہیں۔ یہ آپ کو
بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور آپ اُن لوگوں میں ہیں، جو
بقولِ خود دُنیا کے کام کاج میں مصروف ہیں۔ حالانکہ میرا
خیال ہے کہ یہ مصروفیّت دوسروں کی طرح آپ کو بھی
پریشانی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ اور یہ لمحات مجھے بھی
نصیب ہوتے ہیں۔ جسے نہ کوئی کام ہے۔ اور نہ کوئی
تشویش و پریشانی ہے۔ جب تک کہ گولر ہندوستان سے
باہر نہیں بھیجا جاتا۔"

مَیں۔" آپ کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور مَیں کہتا
ہوں کہ آپ ضرور گولر کھایا کیجئے! یہ صحت کے لئے بہت
مفید ہیں۔ ان سے نیند بہت اچھی آتی ہے۔ انکے بھنگوں
سے آنکھوں میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ یہ قناعت کے
سبب ہیں۔ اور انسان کے لئے بہشتی میوے!"

اجنبی۔" مَیں ہمیشہ کہا کرتا ہوں۔ کہ جب حضرت آدمؑ
اور حوّا جنّت سے نکالے گئے تو وہ ایک گولر اپنے ساتھ
چھپا لائے تھے۔ اس کا پھول اہلِ جنّت کو اس قدر پسند
ہے۔ کہ اب تک فرشتے اس کو ہماری زمین کی ہوا نہیں
لگنے دیتے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہُوئی کہ اس
نمائش پرست دُنیا میں میرے سوا ایک شخص اور بھی ہے
جو گولر کی کماحقہٗ عزّت کرتا۔ اور دل میں اس کی محبت رکھتا
ہے۔ ایسے لوگ دُنیا میں شاذ ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔"
پھر اُس نے کسی قدر متفکّر لہجے میں پوچھا۔" اجنبی یہاں سے

کتنی دُور ہے۔ اور وہاں کوئی سرائے ایسی ہے۔ جس میں مجھ جیسے آدمی کو ٹھکانا مل جائے؟"

میں۔ اجنتا یہاں سے کوئی چار پانچ میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اور ہاں ایک سرائے وہاں ہے۔ اُس میں خاصا آرام مل سکتا ہے۔ لیکن آپ کے پاس کرایہ ادا کرنے کے لئے کچھ پیسے ہیں؟ میں کچھ آپ کی خدمت میں نذر کر دوں؟"

اجنبی (نہایت خوشی مگر وقار کے ساتھ) ہاں جتنے آپ بہ آسانی دے سکتے ہوں۔"

مَیں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ صرف دو روپے سات آنے نکلے۔ "یہ لیجئے دو روپے سات آنے ہیں۔"

اجنبی (روپے اور ریزگی ایک دھجی میں لپیٹتے ہُوئے) "تسلیم، اچھا تو اب رخصت۔"

میں۔ میری خواہش تھی۔ کہ ہم پھر کبھی ملیں۔ اور بہت سے معاملات پر گفتگو کریں۔ یہاں تک تو ہم دونوں متفق ہیں۔ آپ اور مجھ جیسے لوگ اس دنیا میں اکثر تنہا رہتے ہیں۔ کبھی کسی ہمخیال سے مل بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔"

اجنبی نے میری طرف دیکھا۔ اور سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"نہیں! یقیناً ہم دونوں دوبارہ کبھی نہیں ملیں گے۔"

بوڑھے سیّاح نے آگے بڑھ کر پھر بڑی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اور جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہُوا سامنے کے جھنڈوں میں دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔

غلام ربانی

اورنگ آباد دکن

جذبات

منت کشِ نسیمِ سحر یہ چمن نہیں پژمردہ دل میں ایک بھی زخمِ کہن نہیں

کیا مطمئن ہو جلوہ ترا چشمِ غیر میں ہر دامنِ نگاہ سوادِ وطن نہیں

ہر روئے گل میں باغِ جناں کی ہے کب بہا ہر گیسوئے سیاہ کا دامن ختن نہیں

مایوسیوں نے سارے زمانے سے کھو دیا وہ ہم نہیں وہ دل نہیں وہ انجمن نہیں

اے وحشتِ جنونِ محبت خدا گواہ تو ہے اگر تو مجھ کو غمِ پیرہن نہیں

جس دن سے مٹ گیا ہے مرا نقشِ آرزو وہ رونقِ بہار و طرازِ چمن نہیں

تصویرِ دل ہے یوں تو مری ہر نگاہِ یاس البتہ چشمِ تر میں فریبِ سخن نہیں

منصور یوں تو سینکڑوں بن جائینگے مگر وہ میہماں نوازیِ دار و رسن نہیں

گلزارِ آرزو میں ہیں کانٹے بھی بے شمار ہر مرکزِ نگاہ گل و یاسمن نہیں

واقف نہیں کوئی مرے سوز و گداز سے بے بہرہ ہے جو شمعِ سرِ انجمن نہیں

رغبت ہوئی نہ خندۂ گل سے مجھے کبھی از بسکہ اُس میں رنگِ دلِ پُرمحن نہیں

پھولوں سے کم نہیں دلِ بلبل کے زخم بھی کیونکر کہوں کہ کنجِ قفس میں چمن نہیں

نازاں میں اپنی ہمتِ پائے طلب پہ ہوں صحرا میں سر کو پھوڑ لوں کچھ کوہکن نہیں

دل محشرِ خیال ہے اس میں وہ کیا رہیں
ہادیؔ یہ کوئی بزم نہیں انجمن نہیں

ہادی مچھلی شہری

کوہسار شملہ

(مولانا تاجور نے یہ نظم انجمن کے جلسۂ شملہ کے لئے اثنائے سفر میں لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مختلف مناظر کا ایک مرقع ہے جو انکی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے آتے۔ تاہم کیفیتِ قلب چونکہ شروع سے لے کر اخیر تک ایک ہے۔ اس لئے اس کے اجزا میں ایک معنوی ربط پیدا ہوگیا ہے، جو اس قسم کی نظموں میں خارجی مناظر کے تسلسل سے کہیں زیادہ ضروری ہوتا ہے۔
اس نظم کا کچھ حصہ رسالہ ہمایوں میں چھپ چکا ہے لیکن بصورتِ موجودہ مکمل ہے)
ایڈیٹر

ہمالیہ پہاڑ کی بلندیوں کے سلسلے!! نپولین کے حوصلے پہاڑیوں کے سلسلے!!
پہاڑ در پہاڑ ہیں زمیں سے لے کے تا فلک یہ سیڑھیوں کا سلسلہ ہے بام آسماں تلک
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پلین میں برس رہی ہو آگ تو پہاڑ چل! پلین کی فضائے آتشیں کو چھوڑ چھاڑ چل!
بلندیوں پہ چڑھ کے لطفِ سیر کوہسار دیکھ! پہاڑ چل پہاڑ! کوہسار کی بہار دیکھ!
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

کالکا سے شملے کو روانگی

بلندیوں کے دیکھنے کی آرزو نکل گئی بڑھی جو کالکا سے ریل سینری بدل گئی
یہ جانفروز چاندنی یہ دل نواز چاندنی پہاڑیوں سے کر رہی ہے ساز باز چاندنی
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

کہیں ہے میل ریل میں کہیں ہے کھیل ریل میں مسافروں کی ہو رہی ہے ریل پیل ریل میں
یہ سینری نظر پڑی تو کھیل ویل چھوڑ کر ادھر کو جھک پڑے ہیں سارے شغل اپل چھوڑ کر
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

سرنگ اور ریل

نگاہیں محو تھیں کہ ریل آ گئی سرنگ میں ہو جیسے دوست دل میں یوں سما گئی سرنگ میں

سرنگ میں چلی ہے سین کیا دکھا رہی ہے ریل ۔۔۔ کہ جیسے سانپ بل میں آرہا ہو جا رہی ہے ریل

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

سرنگ ہے کہ خلوتِ دلِ سیاہ کار ہے ۔۔۔ سرنگ ہے کہ ہیبت شبِ فراق یار ہے

سرنگ میں ہے ریل جیسے بیقرار خواہشیں ۔۔۔ مچل رہی ہوں دل میں دیکھ کر کہیں نوازشیں

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

وہ رنگ بھی بدل رہی ہے ریل سین دیکھئے! ۔۔۔ سرنگ سے نکل رہی ہے ریل سین دیکھئے!

سرنگ سے چلی ہے جیسے کوئی گرمِ جستجو ۔۔۔ چلا ہو عمکدے سے اپنے لے کے دردِ آرزو

یہ سین تیرا اے پہاڑ کس قدر حسین ہے!!

غار

یہ گہرے گہرے کھڈ یہ خوفناک غار دیکھئے!! ۔۔۔ ضرور یہ مہیب سین ایک بار دیکھئے!!

خدا تیری پناہ! غار ہیں کہ بے شمار ہیں!! ۔۔۔ الٰہی الاماں یہ غار ہیں کہ جاں شکار ہیں!!

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پہاڑ کی بلند آسماں وقار چوٹیاں ۔۔۔ ہیں صنعِ صانعِ ازل کی شاہ کار چوٹیاں

فلک سے ہمسری کے ولولے تھے تھم گئے ہیں کیا؟ ۔۔۔ زمیں کے حوصلے بلند ہو کے جم گئے ہیں کیا؟

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

ریل سے ماہتاب کا نظارہ

یہ دل لگی یہ کود پھاند اے پہاڑ چاند کی ۔۔۔ یہ ریل کے مسافروں سے چھیڑ چھاڑ چاند کی

کبھی اِدھر چمک گیا کبھی اُدھر نکل گیا ۔۔۔ اِدھر اُدھر چمک کے اپنی سمت پھر بدل گیا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

نکل رہا ہے چودھویں کا چاند آسمان پر ۔۔۔ پہاڑیوں پہ چاند کھیت کر رہا ہے شان پر

پہاڑیاں چمک رہی ہیں کیسی آن بان سے ۔۔۔ برس رہا ہے چودھویں کا چاند آسمان سے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

پہاڑی لوگوں کے گیت

پہاڑیوں کے گیت سے ہیں وجد میں پہاڑیاں — درخت مست بے طرح ہیں جھومتی ہیں جھاڑیاں

فضا میں نشہ تیرتا ہے جس سے رات مست ہے — میں مست ہوں کہ آج رات کائنات مست ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

دُھوپ

یہ کون جلوہ گر ہے اے پہاڑ تیری دُھوپ میں — ہے کس کا حُسن جلوہ ریز اس سنہری روپ میں

چمک رہا ہے گوشہ گوشہ جس سے شش جہات کا — دمک رہا ہے ذرّہ ذرّہ تیری کائنات کا

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

شام

ہے کتنا دل گداز سین غم فشار شام کا — ہے چہرہ کس قدر حسین افق نگار شام کا

افق نگار شام کیا شفق سے لالہ فام ہے — شفق سے لالہ فام شام دلفروز شام ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

دھنک کمان

حسینۂ فلک کی کیا یہ قوسِ ہفت رنگ ہے!! — کہ اس کے رنگ دیکھ کر ہر اک کی عقل دنگ ہے!!

یہ سین یہ حسین سین اک بلائے ہوش ہے — دھنک کمان کا نظارہ بیخودی فروش ہے

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

چیل کے درخت

یہ چیل کے درخت ہیں ستونِ سقفِ بے ستوں — یہ چیل کے درخت ہیں حریفِ چرخِ نیلگوں

برس رہی ہے دلکشی قدِ فلک شگاف پر — خطوطِ مستقیم ہیں فضا کی سطحِ صاف پر

یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

حسین فطرت اس چمن میں بے نقاب ہوگئی
یہ بے نقاب ہوگئی کہ لاجواب ہوگئی
نقابِ رخ اُٹھادیا دلوں پہ قہر ڈھا دیا
خداپرست مولوی کو نیچری بنا دیا
یہ سین تیرا اے پہاڑ! کس قدر حسین ہے!!

ناؔجور

کلام میر

ہے دردِ محبت بے درماں کیا فایدہ زحمتِ بیجا سے
عیسےٰ بھی عیادت کو آئے بیمار ترا اچھا نہ ہوا
عزّت سے گیا حرمت سے گیا انصاف یہ ہے شیدا تیرا
دل دے کے غلام ہوا تیرا اے جانِ جہاں شیدا نہ ہوا
ہے قحطِ رجال زمانے میں اس دور کے شیر بھی روباہ ہیں
مدّت سے ہے دنیا چشم براہ کوئی مردِ خدا پیدا نہ ہوا
آزاد جسے تم کہتے ہو ممکن ہے کہ وہ آزاد نہ ہو
آزاد حقیقت میں ہے وہی جو بندۂ حرص و ہوا نہ ہوا
ہم در پہ بتوں کے جاتے ہیں سر سامنے ان کے جھکاتے ہیں
مسجود ہوئے لاکھوں اپنے معبود جب ایک خدا نہ ہوا
ہر جزو کی عزّت کل میں ہے جب قطرہ ہوا قطروں سے جدا
موتی بھی ہوا شبنم بھی ہوا آنسو بھی ہوا دریا نہ ہوا
سچ کہتے ہیں وہ اے میؔر کہ ہے محتاج دلیل ترا دعویٰ
یہ عشق کہاں کا عشق ہے تو عاشق تو ہوا رسوا نہ ہوا

میر ولی اللہ

شفق

بہارِ صبح عجب دلفروز منظر ہے
ہوائیں مشک فشاں ہیں فضا معطر ہے
شفق کے رنگ سے لبریز چرخ اخضر ہے
کوئی کہے کہ یہ موج شراب احمر ہے
چھلک پڑے ہیں ستاروں کے جام بلّوریں
تو سطح چرخ ہوئی ہے شراب سے رنگیں

ریاضِ خلد کا رنگِ جمال ہے؟ کیا ہے؟ یہ خواب ہے کہ طلسمِ خیال ہے؟ کیا ہے؟
مری نگاہ کی حدِ کمال ہے؟ کیا ہے؟ یہ روز و شب کا مقامِ وصال ہے؟ کیا ہے؟

بلندیوں پہ یہ رنگیں مکان کیسا ہے
جہان بھر سے انوکھا جہان کیسا ہے

رُخِ نگار کہے، قصرِ زرنگار کہے طلسمِ رنگ کہے، مستیٔ بہار کہے
جو دیکھ لے کوئی شاعر تو لالہ زار کہے بلند بام کہے، آسماں وقار کہے

فروغِ نور سے کل کائنات رنگیں ہے
مگر عروسِ فلک کو خیال تزئیں ہے

بہارِ موج پہ رقصاں ہے عکسِ نورِ شفق ہے سطحِ آب کی گہرائیوں میں طورِ شفق
ہر ایک چیز پہ طاری ہُوا سرورِ شفق ہر ایک چیز ہے غرقِ مئے طہورِ شفق

چھلک رہی ہے یہ مینائے رنگ و بو گویا
شراب نوش ہے دُنیائے رنگ و بو گویا

وہ رنگ ہے کہ عیاں رنگِ حسنِ فطرت ہے شفق کا سُرخ سا آنچل نظر کی جنّت ہے
ہجومِ کیف ہے دل پر وفورِ عشرت ہے لطافتوں میں شفق حاصلِ لطافت ہے

تاثرات ہجومِ سرور میں گم ہیں
تصوّرات ہجومِ سرور میں گم ہیں

کسی کی یاد ہے دُنیائے عشق میں گلریز کسی کی یاد ہے دُنیائے دل میں عنبر بیز
بہار پیکر و درد آشنا و مہر انگیز خیال پرور و کیف آشکار و عشرت خیز

کسی کے حُسن کے جلوے نہاں ہیں آنکھوں میں
بہارِ عشق کی رنگینیاں ہیں آنکھوں میں

جلال الدین اکبر

شعر و شاعر

(ایک بے قافیہ نظم)

اے شعر تیری کس سے ثنا ہو؟
مدحت سرائی ہو کس سے تیری؟
ہے ایک عالم کہ تجھ پہ فدا ہے
جو دل ہے۔ وارفتہ تیرے اثر کا۔
ہوتا نہ گر تو یوں جلوہ فرما،
تو راگ کا نام لیتا نہ کوئی؛
کان آشنا ہوتے کب زیر و بم سے،
نظم سخن کا کب رنگ بندھتا۔
اے شعر اوصاف ہیں تیرے بیحد؛
علم و ادب کا تو ہی ہے زیور۔

اے شعر تو ہر زباں کی ہے ابجد؛
حسن بیاں کا غازہ ہے تو ہی۔
نقاش ہے تو جذبات دل کا،
عشق و محبت کا گہوارہ ہے تو،
روح رواں جسم عرفاں کی تو ہے،
بے شبہ تو ہے حقیقت کا جوہر۔
جو کچھ گیا دل نہ تیرے اثر سے،
گردن نہ جس کی ہل جائے تجھ پر
سمجھو کہ انسانیت سے ہے خارج۔
ماثور ہیں تجھ سے ذی عقل سارے۔

بیشک گل تر ہے سوبھا چمن کی،
ہے بحر کی آبرو گوہر تر،
گل کوئی لیکن دیکھا ہے ایسا
محفوظ ہو جو سموم و خزاں سے
صرصر سے جو ہو حفظ و اماں میں
منقار بلبل سے مامون ہو جو؟
ہر پھول کے ساتھ کانٹا اگر ہے،
ہے بال کی آر موتی کے سر پہ،
ہے شعر تر ہی باقی و دائم،
اس سے فنا اور ہے نیست عاری۔

جب ریل تھی اور نہ تھا تار برقی،
دنیا میں جب تھی نہ ڈاک اور سٹیمر،
نکلے نہ تھے جب یہاں چھاپہ خانے،

اخبار کی تھی نہ ہم کو خبر تک،
اُس وقت جو ہو گئے شعر موزوں
اس وقت سر تاج عالم کے ہیں وہ،
سرمشق ہیں وہ سب شاعروں کے۔
ابتک دلوں پر قبضہ ہے اُن کا،
قائم یقیناً رہے گا ابد تک۔
دل سے نہیں نقش وہ مٹنے والے۔

یہ یاد رکھنا لیکن، عزیزو،
یہ شان ہے شعر کی جو ہو اصلی۔
بھُولے ہیں جس پہ شاعر ہمارے
تعریف سمجھے ہیں وہ شعر کی یہ،
ہو بحر جس میں، اور قافیہ ہو،
لفظی رعایات ہوں چند اس میں،
ہو خرق عادت، مافوق فطرت،
قدرت کی تنظیر اس میں نہ کچھ ہو،
احساس طبعی نہ لطف حقیقت،
ہو سربسر ایک تصویر وہمی۔

وہ موشگافی کہ توبہ الٰہی،
وہ زیور مستعار اس پہ لادیں،
مانگے کے پہنائیں وہ اس کو کپڑے،
ہو شکل اصلی وہی ہیولے،
غائب حقیقت ہو شعر کی سب،
آرایشوں کا بنے اِک پلندہ،
ہو کوئی جدّت نہ کچھ تازگی ہو،
محبس ہوں اس کے ردیف و قوافی۔
شعر ایسا اچھّا بھی ہو۔ اثر سے
ہوگا معرّا، مطلب سے خالی۔

اے شعر گوئی، کیا سحر ہے تو،
قربان تجھ پہ شاہوں کی شاہی،
لطف سخن، تجھ میں وہ موہنی ہے،
ہر دِل پہ تیرا سکّہ جما ہے،
جو سچّے شاعر گُزرے جہاں میں
یا سرستی کے اب بھی بھگت ہیں
ہم سے بیاں ہو کیا شان ان کی؟
گو پاس ان کے حشمت نہ زر ہو؛
لیکن غنا کے وہ بادشا ہیں،
سلطان ہیں وہ اقلیم دل کے

انہیں نے تو سوتی قومیں جگائیں،

بندے کرائے آزاد انہیں نے،
حُبِّ وطن کا مژدہ سنایا،
اُلفت دلوں میں کی نور افگن،
اُکسایا دِل میں شوقِ ترقی،
امن و اماں کا کیا نصب جھنڈا،
کھویا دلوں سے بغض و حسد کو،
دیا صلح کا کل جہاں کو سندیسا۔
فاتح رہے فتح میں جس کی قاصر
شاعر نے اس دل میں تخت آ بچھایا۔

اے نکتہ سنجو، نقشِ قدم پر

لازم ہے ان کے ہم سب کو چلنا۔
چھوڑو خیالی معشوق کو اب؛
معشوق بہبودِ عالم کو جانو۔
رشک اور رقابت آپس کی چھوڑو،
علم و ادب ہو دلبر تمہارا،
جوشِ محبت پھونکو دلوں میں،
دھو ڈالو داغ کہن سب دلوں سے۔
ہمت باندھو گے اس کام پر تم،
تو سرستی مہرباں ہوں گی تم پر۔

کیفیؔ

گلیونؔ کا بانکا

(مائیکل آرلین کی مشہور عالم کتاب "جاذب نظر شخصیتیں" کے ایک افسانہ کا ترجمہ مسز ز۔ د)

شاید آپ کبھی اس بات کا احساس نہ کر سکتے کہ طلعت کسی طرح غیر مطمئن تھی۔ شاید آپ کو کبھی اس بات کے امکان کا احساس بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کے پاس کیا شے موجود نہ تھی۔ وہ خورشید الزمان وکیل سرکار کی بیوی تھی۔ خوبصورت نازک۔ متناسب الاعضا طلعت کے متعلق میں کونسی ایسی بات کہوں جو آگے نہ کہی جا چکی ہو۔ وہ ایک دنیادار عورت تھی۔ ہر شخص اسے جانتا تھا۔ لیکن اس کے خلاف کچھ نہیں جانتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی بے پردہ لیکن باعصمت خاتون تھی جس نے کسی قسم کی چھوٹی شہرت کی کبھی خواہش نہیں کی۔ مختصراً وہ امرا کے طبقے کی محبوب ترین زینت تھی۔ طلعت کی تعریف کرنا فیشن میں داخل تھا۔ اور ان لوگوں کے خیالات بہت سطحی ہیں۔ جو یہ کہیں کہ تمام فیشن سطحی ہیں۔ کیونکہ ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جس میں تغیر نہ ہو۔ اور اگر فیشن میں معمول سے زیادہ تغیر ہوتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے۔ . . . . . .

خیر یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ اور علاوہ ازیں میں کوئی فیشن کی تاریخ تو نہیں لکھنے بیٹھا۔ ہاں مجھے اس بات پر ضرور پریشانی اٹھانی پڑتی ہے کہ درحقیقت اس بات کی وجہ کیا ہے۔ کہ افسانوں اور ناولوں میں امرا اور غربا کے لئے علیحدہ علیحدہ قوانین زندگی فرض کر لئے جاتے ہیں۔ الفاظ کے بین السطور سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ گویا دوستی صرف متوسط الحال طبقے کی خصوصیت ہے۔ اور امرا اس جذبے سے بالکل عاری ہیں۔

سالہا سال سے ہندوستان اس ظلم خیال کے ماتحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس ظلم خیال کو متوسط الحال طبقہ کہتے ہیں۔ ہر ایک شخص اس طبقے کی تعریف کرتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی مصنف اس طبقے کے متعلق لکھے۔ تو کہا جاتا ہے کہ وہ واقعیت کا ماہر ہے۔ مگر وہ غریبوں کے متعلق کچھ لکھے تو کہا جاتا ہے، ایسے اشخاص کے متعلق لکھ رہا ہے جن کی کوئی ہستی نہیں وغیرہ وغیرہ لیکن خیر یہ تمام باتیں غیر موثر ہیں کیونکہ ہم صرف طلعت کا ذکر کر رہے ہیں۔

اس کے کئی دوست تھے۔ لیکن وہ کسی کی دوست نہ تھی۔ کیونکہ طلعت کی عادت تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو کبھی اپنی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف سے بھی مطلع نہ کرتی۔

کیونکہ وہ بالطبع شرمیلی تھی۔ اس کے ذوقِ سلیم اسکی حاضر جوابی اس کی سنجیدہ تہذیب کی تہ میں شرم کا ایک گہرا احساس پوشیدہ تھا۔ اپنی حیات روشن کے درمیان میں وہ اس خیال کو کبھی دل سے محو نہ کر سکی کہ شاید اس کی باتیں لوگوں کو اکتا دینگی۔ ان تمام رازوں میں سے جو طلعت کے دل میں پوشیدہ تھے۔ ایک یہ بھی تھا۔ کہ اس کی برودت حیات جدّتِ عشق کے لئے بیتاب تھی۔ وہ شروع ہی سے اپنے تخیّل میں عشق کی فضاؤں میں پرورش پاکر جوان ہوئی تھی۔ خورشید الزمان وکیل سرکار ان خیالات سے کوسوں نفور تھا۔ وہ طلعت سے محبت کرتا تھا۔ لیکن وکیلِ سرکار بن کر زندگی بسر کرنا نہایت واہیات طریق سے زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لئے وہ اپنے وقت کا باقیماندہ حصّہ اکثر و بیشتر اس کے ہمراہ بسر کر دیا کرتا۔

طلعت کی زندگی میں عشق اس وقت داخل ہوا ' جب وہ یہ کہتے ہوئے کئی دفعہ سُنی جا چکی تھی کہ میں اب بُوڑھی ہو چکی ہوں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ جب جلال انور پاشا عشق کی تمام رنگینیوں کو لیکر اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ جنگِ عظیم کے دوران میں کئی کارنمایاں انجام دے چکا تھا۔ اور اب یونانیوں کے مظالم کا شکار ہو کر اپنے وطن کو چھوڑ کر ہندوستان میں آبسا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ آدھے سے زیادہ قسطنطنیہ اس کے خاندان کی ملکیت تھا۔ جو ایک بالکل فطرتی خفیفت ہے۔ کیونکہ آجکل ہندوستان میں کئی ایسے ترکی خاندان ہیں ' جو فرداً فرداً آدھے سے زیادہ قسطنطنیہ کے مالک تھے۔

جلال انور ایک مُصوّر تھا۔ اور لوگ فیشن کے طور پر کہتے پھرتے تھے۔ کہ وہ ایک مُصوّر ہے۔ آپ سے توقع کی جاتی تھی۔ کہ آپ اس کی عزّت کرینگے۔ کیونکہ وہ زورِ بازو سے کما کر کھاتا تھا۔ تہذیب سے مجبور ہو کر اس کی عزّت کرنا آپ کا فرض تھا۔ لیکن آپ یہ نہیں سمجھ سکتے۔ کہ جب آپ کسی پان فروش کے متعلق کہیں ' کہ وہ زورِ بازو سے کما کر کھاتا ہے۔ تو سُننے والوں کے دل میں پان فروش کی عزّت کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن زندگی ترکوں کے لئے ایک علیحدہ سی چیز ہے۔ کیونکہ وہ شراب پی کر بھی کچھ سنجیدہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی مصوّری صرف یہاں تک محدود تھی۔ کہ وہ طبقۂ امراء میں سے کسی مرد یا عورت کی تصویر بناتا۔ تصویر کیا بناتا۔ تصویر کی تضحیک کرتا۔ اور پھر خدا جانے کس طرح اس تصویر کو لاہور کے ایک مصوّر رسالے کے ہاتھ بیچ ڈالتا۔ آپ اس کی تصویر کو ہزار تصویروں میں پہچان لیتے۔ نہایت لمبی لمبی آنکھ مجنوں کی پسلیوں کی طرح پتلی پتلی انگلیاں۔ بیٹھنے اور کھڑا ہونے کا عجیب عجیب انداز بیک نظر اس بات کی شہادت دیتا کہ یہ مضحک تصویر حضرت جلال انور کے موئے قلم کی ممنون ہے۔

طبقۂ اُمرا کی عورتیں اس پر شیدا تھیں۔ کہتی تھیں" یہ ترک کس قدر بہادر اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔"

اسی جلال انور میں طلعت نے اپنی محبت کی تابانی کو منعکس پایا۔ اس سے پیشتر طلعت کی شہرت کے عذارِ صفا پر بدنامی کا کوئی داغ نہ تھا۔ اور اس کے بعد بھی اسے کوئی بدنامی نہیں اُٹھانی پڑی۔ اس کی نیک نفسی اور عصمت لاہور میں زبان زدِ خاص و عام تھی۔ سر محمد حسین بیدل اِسبات کی حتمی اور قطعی دلیل ہیں۔ جنگِ عظیم فرنگ کے دوران میں اُنہوں نے طلعت کے ساتھ چالیس دفعہ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور علاوہ ازیں غیر محدود مواقع پر اس سے ملاقی ہوئے۔ اور نہ صرف ملاقی ہوئے، بلکہ طلعت کو سلام کیا اور طلعت نے ان کو جواب بھی دیا۔ وہ مدعی ہیں کہ طلعت نے ایک دفعہ وزیرِ مال سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔" مجھے چھپے ہوئے گناہوں اور خاصکر چھپی ہوئی محبت سے سخت نفرت ہے۔"

وزیرِ مال نے جواب دیا۔" بالکل درست! بالکل درست!!"

تھوڑے عرصے کے بعد معدے کی شکایت کے باعث وزیرِ مال کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور ساتھ ہی طلعت کو جلال انور سے عشق کرنا پڑا۔

---

(۲)

کبھی تصاویرِ متحرکہ یا تمثیل کا شوق انہیں باہم ہونے پر مجبور نہ کر سکا۔ لوگوں نے جلال انور کو طلعت کے ہاں دیکھا۔ لیکن اور مہمانوں کی شخصیت میں اس کی شخصیت مدغم ہو کر رہ گئی۔ شام کے وقت طلعت اپنے عاشق کے کمرے میں جو مزنگ میں واقع تھا چلی جاتی۔

طلعت کو اُس کمرے کی گم سُم تنہا خاموشی میں داخل ہو کر ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوتا مہمانوں کی آؤ بھگت کا تکلیف دہ احساس اور اُن کی آوازوں کا ناخوشگوار مجموعہ اس کے دماغ سے محو ہو جاتا۔ اس کی ہنگامہ خیز مسرتِ قلب اور معمولی رسمیاتِ حیات کے درمیان محبت کی سنہری اور پیاری کہر حائل ہو جاتی۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ جاتی اور جلال انور کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔

کمرے میں سازو سامان بہت کم تھا۔ اور اگر طلعت کا بس چلتا تو وہ کمرے کو عظمتِ بابل کے عہد کا ایک ریاضِ عشرت بنا دیتی۔ لیکن جلال انور نے طلعت سے کسی قسم کی مالی مدد لینے سے قطعی اور حتمی طور پر انکار کیا۔

اکثر ان میں شکر رنجیاں ہو جاتیں۔ الزام چھوٹی موٹی لڑائیاں اور پھر صلح۔ تھوڑے عرصے کے بعد طلعت کو احساس

ہُوا۔ کہ یہ بات ترکوں کی فطرت میں داخل ہے۔ کہ وُہ بات کا بتنگڑ بنالیں۔ اور پھر نہایت رسیلے طور پر صلح کرلیں اکثر طلعت کہا کرتی "اس قسم کی لڑائیاں میرے سکونِ قلب کو برباد کردینگی۔"

جلال انور نے جواب دیا "طلعت تم لڑائی کے صحیح معنی نہیں سمجھ سکتیں۔"

ایک شام طلعت اپنے عاشق کے کمرے سے نکلکر مزنگ روڈ پر فٹن کی تلاش میں آئی۔ رات کے گیارہ بجے کا عمل ہوگا۔ سردی کا موسم تھا۔ اور ہوا گوشت میں گھسی جارہی تھی۔ یکایک ایک دراز قامت شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے ہُوئے اس کے سامنے آکھڑا ہُوا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا کہ طلعت گذر نہ سکتی تھی۔ اور اس کا چہرہ طلعت کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔ اس کے ناک نے جو کبھی خوبصورت ہوگا لیکن جو کسی ضرب شدید کی وجہ سے نمایاں طور پر ایک طرف کو مڑ گیا تھا اس کے چہرے میں ایک مبہم سا اندازِ ہیبت پیدا کر دیا تھا۔ اس نے ایک طنزیہ سے انداز میں طلعت کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کے سر پر ایک چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں شاید اس طرح کی ٹوپیاں بحری قزاق استعمال کرتے ہونگے۔ وہ چھاتی پر ہاتھ رکھ کر ایک خاص نفاستِ انداز سے جُھکا۔ کہنے لگا۔

"طلعت خاتون آداب عرض کرتا ہوں۔"

طلعت نے مشکوک سے لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے۔۔۔۔۔"

اس میلے کچیلے نوجوان نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے طلعت کو روک دیا۔ اور مُسکرایا۔ پھر بولا۔ "یہ میری بدقسمتی ہے کہ ایکدوسرے سے متعارف نہیں چند ایک امور کے باعث پچھلے دنوں مَیں سوسائٹی جانے سے گریز کرتا رہا ہوں مَیں اس بات سے بھی واقف ہوں۔ کہ آپ کہاں گئی تھیں۔ مَیں اطمینان سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ آپ وہاں کیا کر رہی تھیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے شوہر کو اس بات کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ شوہر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ حاکم بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ بیگم طلعت کیا آپ مجھے بدتہذیب خیال کرینگی۔ اگر مَیں آپ سے پانچسو روپیہ مستعار طلب کروں"

نوجوان بہت میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھا لیکن وہ اسقدر بد تہذیب تھا۔ اسقدر صریحاً اور متناسب طور پر بدتہذیب تھا۔ کہ طلعت کو خیال پیدا ہونے لگا۔ کہ شاید وہ کبھی ایک معزز شخص تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید مردوں کی ہستی اسی لئے گوارا ہے۔ کہ وہ عورتوں کو مسرور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ شخص تو بہت ہی ذلیل ہے۔ اس کو تو میری کوئی پروا نہیں۔

طلعت نے پُوچھا۔ "تو کیا تم دھمکا کر مجھ سے روپیہ وصول کرنا چاہتے ہو۔" اور اس کی آواز کانپ

رہی تھی۔

اُس مکروہ ناک والے شخص نے جواب دیا۔" بیشک اور مَیں کوشش کر رہا ہوں کہ مَیں اس فرض کو مکمل ترین بدتہذیبی سے ادا کروں۔ میرا خیال ہے کہ اگر مَیں ناولوں کے دھمکانے والوں کی طرح آپ سے اظہارِ تعشق کروں تو آپ خوش ہونگی۔ لیکن مَیں جلال انور کی برابری نہیں کرسکتا۔ سُنا جاتا ہے کہ ترک محبّت کرنے کا ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔"

طلعت نے نوجوان کی طرف حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ تذلیل اور نکبت کی وہ کونسی گہرائیاں ہونگی، جہاں پہنچ کر ایک مرد کسی عورت کی اس قدر توہین کرسکتا ہوگا۔

"مجھے اس بات کا احساس ہے۔ کہ آپ مجھ سے بے انتہا نفرت کرتی ہیں۔ پھر بھی میری خواہش ہے۔ کہ وہ پانچسو روپیہ والا معاملہ جسقدر جلد طے ہوجائے۔ اسی قدر بہتر ہوگا۔"

طلعت کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔

آخر کار وہ بولی۔"تم اتنا کچھ جانتے ہو۔ کہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے گھر کا پتہ بھی جانتے ہوگے۔ کل بارہ بجے میرے مکان پر آنا۔ دروازے پر تمہیں میرا نوکر ایک لفافہ دیدیگا۔ کیا اب مَیں جاسکتی ہوں۔"

"بیشک"

اور وہ ایک طرف کو ہوگیا۔

لیکن طلعت خاموش کھڑی رہی۔ وہ اس کے چہرے کی طرف معصوم اور روشن نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اور ان کی گہرائی میں کہیں ایک ہلکی سی مُسکراہٹ زخمی اور مصلوب چھپی ہوئی تھی۔ جو اس کے لبوں تک نہ آسکتی تھی۔

"مجھ سے کبھی کسی شخص نے اس طرح گفتگو نہیں کی۔ تم کون ہو۔"

اس مکروہ ناک والے شخص نے جواب دیا۔" مُعزّز خاتون! مَیں گلیوں کا بانکا ہوں۔"

طلعت نے اس کی طرف غرور سے دیکھا۔" اور کیا گلیوں کا بانکا ہونا کوئی اچھی بات ہے۔"

گلیوں کا بانکا ایک عجیب سے انداز میں مُسکرایا۔ "بیگم طلعت شاید میرا خیال تھا۔ کہ مَیں آپ کا وقت ضائع کر رہا ہوں۔"

طلعت نے سکون سے کہا۔" تم شاید دُنیا میں سب سے بدتر آدمی ہو۔ اور اسی لئے مجھے کچھ تعجب سا ہے۔ تمہیں پانچسو روپیہ مل جائینگے۔ خوب سوچ لو۔ کیا تمہیں ایک ہزار تو نہیں درکار ہے۔"

لیکن بیگم طلعت کا تیغ مثال لہجہ گلیوں کے بانکے کو متاثر نہ کرسکا۔ اس نے جواب دیا۔" مَیں عورتوں سے تحفے لینا پسند نہیں کرتا۔ پانچسو روپیہ میرا حق ہے۔ باقی

پانچسو روپیہ لینا ایک شریف آدمی کے لئے توہین ہے۔

"بیگم طلعت آپ جاسکتی ہیں۔"

"تم ایک شریف آدمی ہو۔ شاید تمہاری مراد یہ ہے کہ تم ایک شریف آدمی تھے۔"

اس نے جواب دیا۔ "شریف آدمی وہ شخص ہے جو کبھی اضطراری طور پر کسی آدمی کی توہین نہیں کرتا۔ وہ جب کسی کی توہین کرتا ہے۔ ارادتاً کرتا ہے۔ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر کرتا ہے۔ مَیں ایک شریف آدمی ہوں۔"

طلعت نے کہا۔ "مجھے امید ہے۔ کہ مَیں پھر کبھی جناب سے ملاقات نہ کرسکونگی۔"

نوجوان کا دُبلا پتلا چہرہ طلعت کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔ "کیا مَیں نے عرض نہیں کیا۔ کہ مَیں گلیوں کا بانکا ہوں۔ مَیں اس فرسودہ عہد میں اپنے کندھوں پر بانکپن اور گناہ کی مردانگی کا بوجھ تنہا اُٹھائے ہُوئے ہوں۔ اس لئے مَیں کوشش کرونگا۔ کہ آپ سے نہ مِلوں۔ لیکن مَیں وعدہ نہیں کرتا۔"

(۴)

دوسری شام طلعت نے جلال انور کو صرف اس ناگوار واقعے کے اجمالی حالات سے آگاہ کیا۔ دھمکانیوالا روپیہ —— اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس سے پیشتر کئی دفعہ طلعت اس کے رخساروں کو تمتماتے ہُوئے دیکھ چکی تھی۔ لیکن آج کا تمتمانا خلاف معمول تھا۔ یہ تمتمانا اس طرح کا تھا۔ جس طرح ایک بچے کے رخسار اس وقت تمتما اُٹھتے ہیں۔ جس وقت اُسے بے قصور پیٹا جائے۔ اس لئے نہایت پُر زور الفاظ میں کہا۔ کہ اسے طلعت کی بیحرمتی گوارا نہ تھی۔ اس لئے طلعت کو مشورہ دیا۔ کہ وہ اس سے ملنا چھوڑ دے۔ لیکن طلعت نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور کہا۔ "پیارے یہ مشکل اور طرح حل ہو گی۔ ہفتوں سے تم اپنے کمرے کے متعلق شکایتیں کر رہے تھے۔ کمرہ بدل دو۔ اور جسقدر دور لو، اسی قدر اچھا۔ مثلاً مرزنگ سے بھاٹی دروازے۔"

طلعت کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ اور جلال نے بھاٹی دروازے کے باہر ان سنسان بنگلوں میں سے ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ جو راوی کی طرف جانے والی سڑک سڑک پر واقع ہے۔ بنگلے کے قریب ایک ڈاکخانہ تھا۔ ایک رات طلعت چلی آرہی تھی۔ کہ دُور سے اس نے گلیوں کے بانکے کو لیٹر بکس کے ساتھ سہارا لگائے ہُوئے کھڑے دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت اور ایک خاص اندازِ تغافل میں کھڑا تھا۔ وہ طلعت کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ ہوا کی ان موجوں پر غور کر رہا تھا۔ جو سڑک پر سے خزاں رسیدہ پتّوں کو اُڑا لئے اُڑائے لئے پھرتی تھیں۔ اور "برباد" کے مفہوم کو ادا کر رہی تھیں۔ طلعت مسکرائی۔ مسکرائی کیا۔ پھر

آہستہ سے بولی۔ "کیا دھمکانے والے بھی تاریخ کی طرح
اپنے آپ کو دُہراتے رہتے ہیں۔"

اس مکروہ ناک والے شخص نے جھک کر فرشی سلام
کیا۔ پھر انتہائے سنجیدگی سے بولا۔ "مولانا شرر کا قول ہے
کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دُہراتی۔ بلکہ مورخ ایک دوسرے
کو دُہراتے رہتے ہیں۔ خوب فقرہ ہے۔ کیا خیال ہے آپکا۔"
طلعت نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم بہت بدتہذیب ہو لیکن
معلوم ہوتا کہ تمہاری بدتہذیبی کے لئے لغت میں کوئی لفظ
موجود نہیں۔ تم جو اپنے آپ کو گلیوں کا بانکا کہتے ہو۔ گلیوں
کی کیچڑ سے بھی زیادہ ذلیل ہو۔"

گلیوں کے بانکے نے آہستہ سے کہا۔ "شاید ایسا ہی
ہو۔ شاید ایسا ہی ہو۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے مہذب آدمیوں
کی بدتہذیبیوں کا علم ہو جاتا ہے۔ اور اسی لئے مہذب آدمی
میرے متعلق غلط رائے قائم کرتے ہیں۔"

اس بات کے متعلق کہ وہ لیٹر بکس کے قریب کیوں کھڑا
تھا۔ اس کے اشارہ نہ کرنے میں ایک خاص قسم کے معنی بین السطور
پنہاں تھے۔ وہ اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی تو گلیوں
کے بانکے نے کہا۔ "بیگم طلعت تم ان عورتوں میں سے ہو۔
جن کے متعلق شاعر قصیدے لکھتے ہیں۔ اور عام لوگ
اپنے خوابوں کو ان کی شمیمِ حسن سے معطر کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ تم ان عورتوں میں سے ہو جن کی یاد زندگی کے بیکس
لمحوں میں انسان کو بے اختیار آتی ہے۔ میری زندگی بیکس
لمحوں کا مجموعہ ہے۔ بیگم طلعت جلدی چلی جاؤ۔"

طلعت نے چلا کر پوچھا۔ "کیا کہا۔"

لیکن گلیوں کا بانکا شاید پھر ہوا پر غور کر رہا تھا۔ وہ ہوا
جو خزاں رسیدہ پتوں کو اِدھر اُدھر لئے پھرتی تھی۔ اور "برباد"
کے مفہوم کو ادا کر رہی تھی۔

گلیوں کے بانکے نے خلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
"جو کچھ میں نے کہا تھا۔ وہ دُہرانے کے قابل نہیں۔ لیکن
میں نے یہ بھی کہا تھا۔ بیگم طلعت جلدی چلی جاؤ۔ اور اب
پھر اسے دُہراتا ہوں۔ بیگم طلعت یہ ایک تنہا جگہ ہے۔
اور گلیوں کا بانکا تمثیل کے ڈاکوؤں کی طرح قانون کی بندشوں
سے آزاد ہے۔ "مُدتیں گزریں میں نے کسی عورت کو گلے سے
نہیں لگایا۔ اور وہ چیز جو اب مجھے ایسا کرنے سے روک
رہی ہے۔ یہ ہے۔ کہ میں نے کبھی ایسی عورت کو گلے سے
نہیں لگایا۔ جو خود مجھ سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہو۔ بیگم طلعت
چلی جاؤ۔"

طلعت ایک سائے کی طرح غائب ہو گئی۔ گھر پہنچ کر
اس نے سو سو کے پانچ نوٹ نکالے۔ وہ نوٹ جو غربت
کے خون۔ دولت کے داغ اور محنت کے عروج سے رنگین
ہیں۔ تمام نوٹ بالکل مصفا تھے۔ لیکن ایک نوٹ پر سُرخ
سیاہی کا داغ تھا۔ گویا کسی نے قصداً انگلی ڈبو کر نوٹ پر

ارادتاً مہر لگا دی ہو۔ نوٹ نوکر کے حوالے کر دئے گئے۔ کہ جب گلیوں کا بانکا آئے، تو اُسے پہنچا دئے جائیں۔

دوسری شام کو اُسے ایک رقعہ ملا۔ رقعے میں درج تھا "مَیں دیکھتا ہوں کہ تم مجھے اس سے بھی بدتر تصور کرتی ہو۔ جس قدر کہ مَیں ہوں۔ یہی میرا مقصد تھا۔ بن مانگے مجھے روپیہ دے کر تم نے دھمکانے والوں کے پیشے کو ذلیل کر دیا۔ ایک شریف آدمی یہ ذلت کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ خدا حافظ۔"

(۴)

طلعت کو اس خط کے موصول ہونے کے بعد اپنی دانائی کے متعلق ایک غرورِ پنہاں کا احساس ہوا۔ وہ سوچتی تھی۔ کہ دُنیا بھر میں شاید میرے سوا کوئی عورت گلیوں کے بانکے کو اس خوبصورتی سے ٹال نہ سکتی۔ اس کی دانائی سے گلیوں کا بانکا گناہ کے ان تاریک پردوں میں پھر چھپ گیا تھا۔ جہاں سے وہ دفعتاً نمودار ہوا تھا۔ انہیں خیالات کی وجہ سے وہ خط کے موصول ہونے کے گیارہ دن بعد گلیوں کے بانکے کو دیکھ کر بیحد متعجب ہوئی نہ صرف متعجب ہوئی۔ بلکہ اس کے سینے میں غصّے کا ایک سیلاب اُمڈنے لگا۔ وہ حقارت کے ایک ناقابلِ بیان جذبے سے متاثر ہو کر اس کے پاس سے گذر جانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ طلعت کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

اُس نے کہا۔ "آپ کی تذلیل میرا مقصد نہیں مگر ــــــ"

"تم کسی طرح میری تذلیل نہیں کر سکتے۔"

گلیوں کے بانکے نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات ہے تو مجھے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خاتون طلعت مَیں کبھی جُوئے میں روپیہ نہیں ہارتا۔ مَیں نے مستقل ارادہ کر لیا ہے۔ کہ مَیں کبھی نہ ہارونگا۔ جہاں تک کہ جوئے جیسی اتفاقی کھیل سے مستقل ارادہ کا تعلق ہے۔ خدا جانے یہ تمہارے حُسن کا تاثر تھا یا کیا۔ کہ مَیں آج ہار گیا۔ اور اپنی عزت کو بچانے کے لئے مجھے سو روپوں کی ضرورت ہے۔"

"تمہاری عزت۔ سبحان اللہ"

گلیوں کے بانکے نے مُسکرا کے جواب دیا۔ "کاش مَیں بھی آپ کی طرح اپنی عزت کو "سبحان اللہ" کہکر ٹال سکتا۔ لیکن پھر آپ جانتی ہیں۔ یہ سو روپیہ کا معاملہ ــــ"

طلعت نے اس کی طرف دیکھا۔ "آج اس کے لبوں پر طنز کا اندازِ تبسّم مفقود تھا۔ بولی "بیشک عزت کے معاملے میں سو روپوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہئے۔ لیکن اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔ مَیں گھر جاتے ہی تمہیں روپیہ پہنچا دوں گی۔"

گلیوں کا بانکا بولا۔ "توبہ! توبہ! مَیں آپ کو یہ

تکلیف دے سکتا ہوں۔ آپ لگے ہاتھوں جلال انور سے یہ رقم مستعار لے لیجئے۔"

طلعت چپ چاپ جلال انور کے ہاں چلی گئی۔ اور کہنے لگی! پیارے وہی آدمی پھر مجھے مل گیا ہے۔ کیا تم مجھے اس وقت سو روپیہ دے سکتے ہو۔"

جلال انور جھنجلا اُٹھا۔ کہ یہ شخص ہمیشہ تنگ کرنے پر تلا رہتا ہے۔ لیکن طلعت نے اسے سمجھا بجھا کر اس کے غصّہ کو فرو کیا۔ جلال انور نے طلعت کو ایک سو روپیہ کا نوٹ دیا۔ اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے واپس جانے کو تھی۔ کہ روشنی میں اس نے نوٹ پر سُرخ سیاہی کا ایک داغ دیکھا۔ اس طرح کا گویا کسی نے قصداً سیاہی میں اُنگلی ڈبو کر ایک مہر سی لگا دی ہو۔ طلعت نے جلال انور کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی زبان خاموش تھی لیکن آنکھوں میں ایک محشرِ گفتگو حرکت کر رہا تھا۔ جلال انور کا چہرہ ایک میلے کچیلے سُکڑے ہُوئے رومال کی طرح زرد پڑ گیا۔ جب وہ باہر نکلی، تو گلیوں کے بانکے نے طلعت کے چہرے میں ایک عجیب تغیّر دیکھا۔ نوٹ کو ہاتھ میں لے کر گلیوں کا بانکا ہنسا۔ پھر اپنے تلخ تریں لہجے میں بولا۔ "طلعت خاتون۔ آج تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ جلال انور کس قسم کا آدمی ہے اس سازش میں وہ بھی شریک تھا۔

اس کے ذمہ یہ کام تھا۔ کہ وہ تمہارے دل میں اپنے عشق کا بیج بو کر تمہیں اپنے گھر بُلائے۔ اور میرا فرض یہ تھا کہ تمہیں دھمکا کر تم سے روپیہ وصول کروں۔ جو روپیہ تم دیتی تھیں۔ وہ ہم آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اس نے صرف روپیہ کے لئے تم سے راہ و رسم پیدا کی۔ مَیں نے قصداً یہ داغدار نوٹ جلال انور کو دیا تھا۔ پہلے دن ہی تمہیں دیکھ کر میرا دل بے چین ہو گیا۔ مَیں نے تمہارے خلاف گناہ کیا ہے۔ لیکن تم نے خود اپنی ذات پر ظلم کیا ہے۔ اپنے حُسن پر ظلم کیا ہے۔ اب جاؤ۔ اور پھر ایسا گناہ نہ کرنا۔"

طلعت نے کہا۔ "تم اور گناہ کا ذکر کرو۔"

بیشک معظّم خاتون کیونکہ صرف شیطان ہی ایک ایسی ہستی ہے۔ جو باختیار لہجے میں گناہوں سے باز رکھنے کی تلقین کر سکتی ہے۔"

اور گلیوں کا بانکا گناہ کے اندھیرے سایوں میں غائب ہو گیا۔

عابد

تبصرہ

نور جہاں - فی زمانہ تعلیمِ نسواں جو روزافزوں ترقی کر رہی ہے۔ اُس کے اسباب و علل ہیں سے، بلکہ یوں کہئے کہ اُسکے نتائج ہیں سے، ایسے رسالوں کا اجرا بھی ہے جن کا مقصد طبقۂ نسواں کی ذہنی ترقی و تربیت ہے۔ اور جن ہیں سے اکثر کی ترتیب و تدوین اسی طبقے کے افراد کے ہاتھوں ہیں ہے۔ ان رسالوں ہیں نور جہاں جس کے اس وقت تک دو نمبر نکل چکے ہیں، ایک خاص درجے کا مستحق ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ اس کا مقصد اکثر دوسرے رسالوں کی طرح عورتوں میں معلومات عامہ کی اشاعت ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُن کی اخلاقی و ذہنی تکمیل اور اُن ہیں صحیح خیالات کا پھیلانا اسکا حقیقی نصب العین ہے دوم:- اس کی ادارت صنفِ لطیف ہی کے ایک فرد کے ذمے ہے۔ ....

....

....

....

....

.... رسالہ کو جب ہیں نے مطالعہ کیا، تو مجھے یہ دیکھ کر کہ زیادہ تر مضامین مردوں کے قلم سے ہیں جن ہیں علّامہ عبداللہ یوسف علی، جناب عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا .... جیسے مشاہیر کے نام نظر آتے ہیں۔ جہاں یہ خوشی ہوئی کہ یہ رسالہ ایسے رہنمایانِ قوم کے پیغام کو عورتوں تک پہنچانے کا وسیلہ ہوگا۔ وہاں یہ یاس انگیز خیال بھی آیا کہ ابھی وہ وقت دُور ہے۔ جب عورتیں غیروں کے ارشاد و ہدایت کو سُننے اور اُس کی تقلید کرنے کی بجائے خود بھی کوئی پیغام دیا کرینگی۔ اس خیال کے اظہار سے میرا یہ مقصد نہیں کہ نور جہاں کی ایڈیٹر صاحبہ عورتوں کے مضامین کو محض اس رعایت سے کہ وہ عورتوں کے مضامین ہیں۔ ایسے مشاہیر ادب کے مضامین پر ترجیح دیں۔ جیسا کہ بعض رسالے کرتے ہیں۔ اور نتیجۃً معیارِ ادبیت سے گر جاتے ہیں۔ بلکہ یہ محض ایک احساس کا بے تکلف اظہار تھا جو میرے دل میں پیدا ہُوا۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ تقطیع $\frac{20\times26}{8}$ ضخامت ۸۰ صفحات کتابت و طباعت گوارا

(ا ب ج)

انجمن ارباب علم پنجاب
کی
تفصیلات آمد و صرف

از اکتوبر ۱۹۲۴ء تا اکتوبر ۱۹۲۵ء

(منظور کردہ مجلس انتظامیہ)

اکتوبر ۱۹۲۴ء سے اکتوبر ۱۹۲۵ء تک انجمن کے گیارہ عام جلسے ہوئے۔ جن میں دو نثر کے اور نو نظم کے تھے۔ دس جلسے ایس پی ایس کے ہال میں ہوئے۔ اور ایک یونیورسٹی کیمیکل لیبوریٹری میں۔ چار وفد انجمن کی طرف سے گوجرانوالہ جہلم فیروزپور شملہ گئے۔ بھلّہ شو کمپنی کا انعامی مقابلہ کا اعلان اینگلو انڈین اخبارات کے سوا تقریباً ہندوستان بھر کے انگریزی اُردو اخبارات اور رسالہ جات نے شائع کیا۔ مُلک کے اکثر اہل قلم اور شعرا تک پہنچایا گیا۔ صوبہ کے اخبارات نے انجمن کا پروپیگنڈا ہندوستان کے ہر گوشے میں کیا۔ سات ہزار پوسٹر اور دستور العمل وغیرہ کی اشاعت ہوئی۔ اس سال کے پروپیگنڈا نے انجمن ارباب علم کو ہندوستان گیر بنانے میں بے حد مدد دی۔ انجمن کے ادبی آرگن ہزارداستان میں سال گزشتہ کا مفصّل آمد و صرف شائع کیا جاتا ہے۔ اور آئندہ ہر ماہ حساب شائع ہوا کریگا۔

"سیکرٹری"

تفصیل اخراجات اشاعت

(۱) پوسٹر جلسہ نمبر ۱ ۲۶×۲۰ تعداد ۵۰۰

	روپے	آنہ	پائی
کاغذ ایک رم	۳	۸	۰
لکھائی	۴	۰	۰
چھپائی	۳	۸	۰
	۱۱	۰	۰

(۲) پوسٹر جلسہ نمبر ۲ ۲۶×۲۰ سائز تعداد ۵۰۰

	روپے	آنہ	پائی
کاغذ ایک رم مفت مل گیا تھا	-	-	-
لکھائی	۴	۰	۰
چھپائی	۳	۸	۰
	۷	۰	۰

(۳) پوسٹر بڑا مستقل ۲۹×۲۲ سائز۔ تعداد ۱۵۰۰

لکھائی ۰—۰—۵

چھپائی ۰—۰—۸

کاغذ تین رم ۰—۰—۲۱

۰—۰—۳۴

(۴) مجوزہ رسالہ بہار کا سہ رنگ پوسٹر ۲۹×۲۲ سائز تعداد ۱۰۰۰

لکھائی۔ مولوی غلام رسول نے مفت لکھ دیا تھا۔

چھپائی ۰—۰—۱۲

کاغذ ۰—۸—۱۳

۰—۸—۲۵

(۵) بھلّہ شو کمپنی کا انعامی اعلان تعداد ۵۰۰

لکھائی ۰—۰—۲

چھپائی ۰—۰—۳

کاغذ ۰—۵—۳

۰—۵—۸

(۶) انجمن کے اغراض و مقاصد، سائز ۲۷×۱۷/۸ تین کاپیاں — تعداد ۱۰۰۰

لکھائی فی کاپی چار روپے کے حساب سے ۰—۰—۱۲

چھپائی ۰—۰—۱۲

کاغذ تین رم ولایتی ۰—۰—۲۱

جلد بندی ۰—۰—۲

۰—۰—۴۷

(۷) رسید بہیاں ۲۰ جلدیں تعداد ۲۵۰۰

لکھائی ۰—۰—۲

زمین کی چھپائی ۰—۰—۴

اصل چھپائی ۰—۰—۴

جلد بندی ۰—۰—۲

کاغذ ۰—۰—۳

۰—۰—۱۵

(۸) ٹکٹ داخلہ برائے جلسہائے ادبی تعداد ۱۰۰۰

کاغذ ۰—۱۲—۱

لکھائی ۰—۰—۱

چھپائی ۰—۰—۲

۰—۱۲—۴

(۹) انجمن کا لیٹر فارم تعداد ۵۰۰

لکھائی ۰—۰—۱

چھپائی ۰—۸—۲

کاغذ ۰—۰—۲

۰—۸—۵

میزان کل ۰—۹—۱۵۸

ڈاک کا خرچ

(۱) بھلّہ شوکمپنی کا اعلان اینگلو انڈین اخبارات کو چھوڑ کر تمام انگریزی اردو اخبارات اور رسالجات کو بھیجا گیا۔ تمام اہل قلم اور ہندوستان بھر کے شعراء کو شرکت مقابلہ کے لئے روانہ کیا گیا ارسال اعلان میں ایک نادانستہ غلطی ہوگئی۔ وہ یہ کہ بجائے دو پیسے کے ٹکٹ لگانے کے ایک ایک آنہ کے تین سو لفافے خرید کر بند لفافے روانہ کئے گئے۔

تین سو لفافے ۰ — ۱۲ — ۱۸

(۲) انجمن کے مطبوعہ قواعد و مقاصد۔ تمام اخبارات رسالجات اہل قلم اور عمائد ہندوستان کو بھیجے گئے۔ دو سو صرف لاہور میں اور ۵۴۰ باقی ہندوستان میں کل ۵۴۰ روانہ کئے گئے پانسو چالیس پیکٹ۔ فی پیکٹ دو پیسے کے حساب سے

۰ — ۴ — ۱۶

(۳) سال بھر میں بارہ جلسے ہوئے۔ سات جلسوں کے لئے فی جلسہ کے لئے فی جلسہ ایک روپے کے لفافے اور تین روپے کے پوسٹ کارڈ شہر میں دعوتی خطوط بھیجنے کے لئے فی جلسہ چار روپے دعوتی خطوط کے لئے سات جلسے

۰ — ۰ — ۲۸

چار جلسوں میں کچھ خطوط چپراسی سے تقسیم کرائے اور ایک روپے فی جلسہ ڈاک ذریعہ بھیجے گئے۔ ۰ — ۰ — ۴

میزان کل ۰ — ۱۰ — ۶۶

اخراجات مجالس ادبیہ

سال بھر میں انجمن کے گیارہ عام جلسے ہوئے جن میں ایک جلسہ یونیورسٹی کیمیکل لیبوریٹری میں ہوا باقی ایس پی ایس کے ہال میں۔

تفصیل اخراجات

(۱) ایس پی ایس کے ہال کا دس ماہ کا کرایہ ۰ — ۰ — ۵۰

ہال کے چپراسی کو ہر جلسہ پر ایک روپیہ انتظام وغیرہ کا ۰ — ۰ — ۱۰

سقّہ۔ دریاں اٹھانے پہنچانے والا قلی دس ماہ کا ۰ — ۰ — ۷

(۲) ہر جلسہ کی ترغیب شرکت کے لئے کم سے کم دو گردشیں ٹانگے پر اہل قلم اور عمائد شہر کے پاس کرنی پڑتی ہیں۔ سال بھر کے ٹانگوں کا خرچ ۰ — ۰ — ۳۶

(۳) ہر جلسہ کے لئے سوائے لیبوریٹری کے جلسے کے کرایہ پر دریاں منگائی گئیں۔

دس جلسوں کی دریوں کا کرایہ ۰ — ۰ — ۳۰

(۴) ہر جلسے کے انگریزی اعلان اور رپورٹیں انگریزی اخبارات کو بھیجی گئیں۔ سال بھر کا ٹائپ کا خرچ ۰ — ۰ — ۱۸

(۵) بھلّہ شوکمپنی کا اعلان ترجمہ کرا کے ہندوستان بھر کے مشہور انگریزی اخبارات کو بذریعہ رجسٹری بھیجا گیا۔ ۰ — ۰ — ۸

(۶) مختلف جلسوں میں علاوہ دیگر حضرات کے تین نقد فی تمغے انجمن نے انعامی مقابلے کے لئے دیئے ۰ — ۱۲ — ۱۲

(۷) اجلاس کمیٹی کے ۳۵ ممبروں کے لئے مخملی کشیدہ کاری کے زرّین بلّے ۰ — ۰ — ۲۵

نوٹ:۔ زائد روپے خود رضاکاروں نے دئے۔

میزان کل ۰ — ۱۲ — ۱۹۶

اخراجات وفود

گزشتہ سال گوجرانوالہ، جموں، فیروزپور، شملہ، ان چار مقامات پر انجمن کے وفد بھیجے گئے۔ گوجرانوالہ کا خرچ اہل شہر نے دیا۔ اور باقی مقامات انجمن نے بہ تفصیل ذیل

خرچ جموں ۰ — ۰ — ۷

فیروزپور دو ممبر ۰ — ۷ — ۸

شملہ ۱۹ آدمی وفد میں شریک تھے۔ گیارہ نے کرایہ انجمن سے لیا۔ بعض نے خرچ خوراک نہیں لیا۔ فی آدمی ۸ — ۰ — ۱۵ ایک ممبر نے ایک طرف کا کرایہ نہیں لیا۔

کل خرچ وفد شملہ کا ۰ — ۰ — ۱۵۸

میزان کل ۰ — ۰ — ۱۷۴

اخراجات دفتر

کرایہ دفتر دس روپے ماہوار کے حساب سے ۰ — ۰ — ۴۰

تنخواہ ملازم منشی گیارہ ماہ کی ۰ — ۰ — ۱۶۵

سائن بورڈ ۰ — ۰ — ۵

مہر ۰ — ۰ — ۳

اسٹیشنری رسالہ بہار حضرت اختر شیرانی کو دئے گئے ۰ — ۰ — ۵

اسٹیشنری، قلمدان، پیڈ، لفافے وغیرہ ۰ — ۰ — ۵

دو رجسٹر ۰ — ۰ — ۲

میزان کل ۰ — ۰ — ۲۲۵

تفصیلات آمد

نظم کے ۹ جلسوں میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ۲ر تھا

آمد فروختگی ٹکٹ

اکتوبر ۱۹۲۴ء	۰ — ۰ — ۴۹
نومبر 〃	۰ — ۰ — ۴۷
دسمبر 〃	۰ — ۰ — ۳۷
جنوری ۱۹۲۵ء	۰ — ۰ — ۴۵
فروری	۰ — ۲ — ۳۶
مارچ	۰ — ۲ — ۴۶
اپریل جلسہ نثر بے ٹکٹ ہوا	
مئی	۰ — ۸ — ۵۲
جون	۰ — ۱۲ — ۱۹
اکتوبر	۰ — ۴ — ۳۱

میزان کل ۰ — ۴ — ۳۶۴

چندۂ ممبری مندرجہ رجسٹر

از اکتوبر ۱۹۲۴ء تا اکتوبر ۱۹۲۵ء

	۰ — ۰ — ۲۹۸
یکمشت	۰ — ۰ — ۲۲
	۰ — ۰ — ۳۱۰

خلاصہ آمد

مجلس ادبیہ	۰ — ۴ — ۳۶۴
چندہ ممبری	۰ — ۰ — ۲۹۸
یکمشت	۰ — ۰ — ۲۲

میزان کل آمد سال ۰ — ۴ — ۶۸۴

خلاصہ آمد وصرف

آمد	صرف
۰ — ۴ — ۶۸۴	۰ — ۱۵ — ۸۱۸

۰ — ۱۵ — ۸۱۸

۰ — ۴ — ۶۸۴

بذمۂ انجمن ۰ — ۴ — ۱۳۴

سیکرٹری نے انجمن سے اپنے اخراجات وفود شملہ فیروزپور۔ جموں نہیں لئے۔ اس طرح انجمن کے قرضہ میں سے ۰ — ۱۲ — ۲۶ اور گھٹ گئے۔

۰ — ۱۱ — ۱۳۴

۰ — ۱۲ — ۲۶

بذمۂ انجمن ۰ — ۱۵ — ۱۰۸

خرچ کی زیادتی شملہ کے سفر کی وجہ سے ہوئی۔ محترم صدر انجمن کی تحریک پر انجمن کا وفد شملہ گیا تھا۔ اس وقت انجمن کا فنڈ بالکل برائے نام تھا۔ سیکرٹری نے محترم صدر کے یہ امید دلانے پر کہ شملے سے انجمن کو روپیہ مل سکیگا۔ اپنی جیب سے گیارہ ممبران وفد کا کرایہ آمد و رفت ادا کیا۔ شملہ میں چندہ کی تحریک نہیں ہوسکی۔ تاہم شملہ کی مجلس استقبالیہ نے اپنا پس انداز ۰ — ۸ — ۸۹ بھیجدیا۔ اس کا حساب فائنینشل سکرٹری آیندہ نمبر میں شائع کریں گے۔

تاجور سیکرٹری

انجمن ارباب علم

از آنریبل خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب بی۔اے بیرسٹرایٹ لا پریزیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل صدر انجمن ارباب علم

سات سال ہوئے لاہور میں چند علم دوست حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ادب اردو کو ترقی دینے کے لئے اور اردو زبان کی خدمت کے لئے ایک انجمن قائم کیجائے، اس خیال کے سب سے بڑے حامی اور مؤید ہمارے دوست مولنا احسان اللہ خاں صاحب تاجور تھے۔ جو ان دنوں مدیر مخزن بھی تھے۔ اور اُن کے حلقۂ احباب میں ہندو اور سکھ شائقین ادب شامل تھے۔ جو اپنے علمی مضامین سے اوراق مخزن کو بھی وقتاً فوقتاً مزین کرتے رہتے تھے۔ ان صاحبوں میں پنڈت میلارام صاحب وفا، پنڈت ونتہ پرشاد صاحب فدا اور سردار اودے سنگھ صاحب شائق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دوستوں نے باہم مشورہ کر کے انجمن ارباب علم کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کے زیر سایہ بزم مشاعرہ گرم ہوئی جو روز بروز زیادہ ہر دلعزیز ہوتی گئی۔ مجھے بھی اس انجمن کے قیام سے دو سال بعد اس میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اور اس وقت سے وہ تعلق مسلسل قائم ہے اس انجمن کی جو بات مجھے دل سے پسند آئی وہ یہ تھی کہ اس نے مذہبی اور سیاسی مخمصوں سے اپنے آپکو ہمیشہ الگ رکھنے کی کوشش کی۔ اور خالص ادبی خدمت کو پیش نظر رکھا۔ اسکے کارکنوں میں ہر مذہب و ملت کے آدمی ہر وقت موجود رہے۔ بلکہ جو لوگ اپنا کلام وہاں پڑھتے رہے ان میں بھی ہندو مسلمان سکھ سب شامل تھے۔ مجمع میں بھی ہمیشہ یہی شان نظر آتی رہی۔ بوڑھے جوان۔ انگریزی خوان اور اردو خوان سر کردہ رہنمایانِ قوم اور ہونہار طلبہ۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب ذوق و شوق سے شریک ہوتے ہیں۔ اور حاضرین کی تعداد ہر جلسہ میں پہلے سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ صدارت کے لئے بھی جہاں بعض مسلمان منتخب ہوتے رہے ہیں متعدد ہندو ماہران سخن کا انتخاب ہوا۔ گویا اس انجمن نے اردو زبان کی خدمت کا شوق رکھنے والوں کے مختلف طبقوں کو یکجا ہو کر اس ذریعہ سے ملک کی بہتری کی عملی کوشش کا موقعہ دیا۔ اب اس کی گزشتہ کامیابی سے کارکنانِ انجمن کی اسقدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ کہ اُن کا ارادہ ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد کو وسیع تر کریں۔ زبان کو زیادہ آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں۔ تاکہ نہ اُس میں عربی الفاظ کی ضرورت سے زیادہ بھرمار ہو نہ سنسکرت الفاظ تکلف سے لائے جائیں۔ قدرتی طور پر جیسے کہ عام بول چال کا محاورہ ہے۔ اسی کا زیادہ رواج ہو۔ اردو شاعری جو جدید ضروریات کے مطابق بہت کچھ قابل اصلاح ہے۔ اس کی اصلاح کیجائے۔ اردو کے علمی ذخیروں میں اضافہ کیا جائے۔ کیونکہ کوئی ملک بغیر اس کے ترقی نہیں کر سکتا۔ کہ اس کی اپنی زبان میں اس کے علمی ذخیرے موجود ہوں۔ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے جو ذریعے سوچے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ ایک خالص علمی اور ادبی رسالہ انجمن کی طرف سے نکلا کرے۔ جس میں اُن مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھپتا رہے جو انجمن کے جلسوں میں پڑھے جائیں۔ اور انجمن کی سرپرستی میں ایک مدرسہ شبینہ قائم ہو۔ جو ایک سرچشمۂ علم ہو جس سے وہ تشنگانِ ادب اپنی پیاس بجھائیں۔ جن کی تعلیم ناموافق حالات کے سبب ادھوری رہگئی ہو۔ اسکے ساتھ ایک ادبی کتبخانہ اور ریڈنگ روم ہو۔ جہاں شائقین کو کتابیں اور اخبارات بیسر آسکیں۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اغراض نہایت مفید اور کار آمد ہیں۔ امید ہے کہ ملکی زبانوں کی ترقی کے سب ہوا خواہ اور سب علمدوست حضرات ان اغراض کی تکمیل میں انجمن کا ہاتھ بٹائینگے۔ اور اس کے فاضل سکرٹری مولنا تاجور صاحب اور ان کے دیگر مددگاروں کی اَن تھک کوششوں کی عملی داد دیکر ملک و قوم کی خدمت کریں گے۔

عبد القادر

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

جانِ ظرافت - ایک بزمیہ ڈراما ہے۔ جس میں ایک بخیل کے بخالت آمیز کارنامے ہنسی دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں - اصل کتاب مولیئر سے ماخوذ اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں۔ جو جرمنی کے مشہور ڈراما نگار لیسنگ اور فارس میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنّفین کی طبعزاد ہیں۔ غرضکہ اس زعفران کی بالیدگی کے لئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ متین اور مہذب ظرافت کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی۔ اس کی خوبی کی اس سے بڑھکر اور کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ عالیجناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا ہے۔ قیمت ۸ ؍ فیجلد۔

قزّاق - جرمنی کے شہرہ آفاق فلسفی شاعر اور ڈراما نگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے نشیب و فراز، اعمالِ بد کے مآلِ کار اور محبّت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ سوز و گداز کے مناظر دل کو لبھاتے ہیں۔ ایڈیٹر رسالہ اردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصوّر کرتے ہیں۔ اور جناب لالہ کنور سین صاحب ایم۔ اے بیرسٹرایٹ لا۔ چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر اسے ازحد دلچسپ خیال فرماتے ہیں قیمت فیجلد ۸ ؍

ظفر کی موت : بلجیم کے چابکدست اور محیرالعقول ڈراما نگار میٹرلنک کی ایک سنگلاخ تصنیف کا سلیس ترجمہ مع حواشی جسمیں ایک ان کی محبت کا جلوہ دکھا کر ان جذبات کو نمایاں کیا ہے جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں۔ اور جنکا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیّت ہے عجب پُر تاثیر کتاب ہے۔ جسکے مطالعہ کے بعد بھی رقت طاری رہتی ہے قیمت ۴ ؍

بگڑے دل - فرانس کے ستم ظریف ڈراما نگار مولیئر کی بہترین تصنیف کا آزاد ترجمہ مبصروں کی رائے میں حسن زبان، اندازِ بیان کے لحاظ سے اس کومیڈی کا جواب ادبیاتِ عالم میں ناپید ہے۔ اور شعار نگاری کا اس سے بہتر نمونہ ملنا ناممکن ہے۔ اس ڈراما میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک شخص بے محابا صداقت شعاری کے ہاتھوں کن الجھنوں میں پھنستا ہے۔ قیمت فیجلد ۸ ؍

تین ٹوپیاں - جو دورِ جدید کی ایک فرانسیسی فارس کا عکس ہے۔ قیمت فیجلد ۸ ؍

ملنے کا پتہ: **مینیجر دی اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ۔ لاہور**

اُردو کا ماہانہ رسالہ شمع آگرہ

جنوری ۱۹۲۵ء سے شمع نہایت آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ، غرض ہر لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ ہر مضمون مہذب محرک خیال اور معلومات جدیدہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اور تاریخی۔ سیاسی۔ اقتصادی و ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کے مقاصد علمی و ادبی ہیں۔ لائق مدیران شمع مسٹر محمد حبیب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا، پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ و مسٹر حسن عابد جعفری (آکسن) بیرسٹرایٹ لا آگرہ ہیں۔ یہ حضرات بہترین تعلیمیافتہ ہونے کے علاوہ اعلےٰ درجہ کے نقاد اور ادیب ہیں اور فن اخبار نویسی سے واقف ہیں۔ اور محض ادبی و علمی خدمت کی آرزو میں رسالہ کی ترتیب میں مصروف ہیں اس میں کوئی ذاتی فایدہ شامل نہیں۔ اور نہ کسی تجارتی اصول پر اس کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہر ماہ میں پابندیِ وقت سے شائع ہوتا ہے۔ تصاویر بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حجم ۱۱۲ صفحہ قیمت سالانہ چھ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۱۰؎

المشتہر مینیجر رسالہ شمع حسین منزل شاہگنج آگرہ

درسِ حیات

مصنفہ محمد اکبر مرادپوری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ کتاب نوجوانوں کے لئے عموماً اور طلبا کے لئے خصوصاً نہایت ہی مفید ہے۔ اگر ایک ناکارہ محض اور سست الوجود نوجوان اسے ایک دفعہ پڑھ لے، تو یقین ہے۔ کہ وہ زندگی کے اصلی مقصد کو ضرور سمجھ جائیگا۔ اس میں جگہ جگہ ہر مذہب و ملت کے بزرگوں اور مشاہیر کے اسوۂ حسنہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ کس طرح دُنیا کے بعض نامور اور لائق آدمی قعرِ گمنامی میں سے نکل کر بامِ عظمت پر پہنچے۔ مختلف عنوانوں کے ماتحت زندگی کے مختلف مدارج پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً مشکلات کا مقابلہ۔ مصائب کے فوائد۔ کیرکٹر۔ خودداری جدوجہد کتب بینی۔ وقت کا استعمال۔ زر کا استعمال۔ خود ضبطی۔ دوستی۔ مطالعہ۔ اور بتایا گیا ہے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے آج کل کے نوجوان طلبا کس طرح اپنی زندگی کا اصلی مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ بڑھیا۔ ضخامت ۲۱۸ صفحات قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک طلبا کیلئے ازحد مفید ہے

مینیجر اردو ہاؤس چیمبرلین روڈ لاہور سے طلب کریں

فطرت نگار سُدرشن کو پانچسو روپیہ انعام

گورنمنٹ پنجاب نے فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کتاب پر اُنہیں پانسو روپیہ انعام دیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کیسی ہوگی اور اسمیں کیا ہوگا مگر سچ کہا جائے تو اُنکی ہر ایک کتاب اس قابل ہے کہ اُس پر کئی کئی ہزار روپیہ انعام دیا جائے۔ یہ کتاب مصنّف نے ہندی میں لکھّی تھی۔ اور اب احباب کے اصرار پر خود ہی اسکا اُردو ترجمہ کر کے شائع کرا دیا ہے۔ اس اُردو کتاب کا نام **محبّت کا انتقام** ہے۔ اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ محبت جب انتقام کی بھوکی ہو جاتی ہے۔ تو کیا کرتی ہے۔ محبّت کا ایثار کئی مصنّفوں نے لکھا ہے مگر محبّت کا انتقام لکھنا قُدرت نے سُدرشن کے لئے اُٹھا رکھّا تھا۔ اور اب وہ چیز تیار ہے اگر آپ کو عورت کی فطرت اور محبّت کا فلسفہ نیز انسانی دل کی بلندیوں اور پستیوں کا علم حاصل کرنا ہو۔ تو محبّت کا انتقام دیکھئے۔ زبان پُرسحر۔ کاغذ چکنا۔ کتابت حُسین۔ چھپائی پیاری۔ عورت، مرد، بچّے بوڑھے سب کے کام کی چیز ہے۔ **قیمت عہ ر**

چندن

اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی پندرہ دلچسپ کہانیاں درج ہیں ہر کہانی پڑھکر یہی خیال گزرتا ہے۔ کہ اس سے اچھّی کہانی مصنّف بھی نہ لکھ سکیگا مگر ہر دوسری کہانی اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ گورنمنٹ پنجاب نے **محبّت کا انتقام** پر انعام دیا ہے لیکن سُدرشن کی نگاہوں میں چندن کا درجہ اُس سے بہت بلند ہے۔ اور اُنہیں اس کتاب کے مصنّف ہونے پر فخر ہے۔ دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے لکھّا ہے۔ **قیمت ۱؍عہ**) سُنہری ریشمی جلد دو روپے

بہارستان

فطرت نگار سُدرشن کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ جس پر مصنّف کو خود ناز ہے اور جسکے متعلّق کئی دوستوں کی رائے ہے کہ یہ سُدرشن کا ماسٹر پیس ہے۔ اگر آپکو بہترین کہانیاں دیکھنا ہو۔ تو بہارستان دیکھئے۔ جسکے مقابلہ کی کتاب اُردو زبان میں آج تک شائع نہیں ہوئی۔ بینظیر کہانیاں ہیں، زبان صاف، پلاٹ دلکش۔ نتیجے دلمیں اُتر جانیوالے، کاغذ خوبصورت۔ طباعت نہایت حسین اور چھپائی پیاری، دیباچہ منشی پریم چند صاحب نے لکھّا ہے۔ **قیمت** عہ ۱۲ر سُنہری ریشمی جلد عہ

قوم پرست

یہ کتاب بنگال کے مشہورِ آفاق ڈرامائسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کے ایک ناٹک کا ترجمہ ہے مگر خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ انسانی جذبات کا موجیں مارتا ہُوا سمندر دیکھنا ہو۔ تو یہ کتاب پڑھیئے۔ جو آپ کی آنکھوں سے زبردستی آنسو نچڑوالیگی عہ ر

چُٹکیاں

نئی طرز، نئی ادا، درختوں، پتھروں اور ندی نالوں کے سرمن۔ چاند تاروں کے اور پھُولوں پھلوں کے لذّت آشنا خیالات، ایک ایک مضمون میں مصنّف نے دل نکال کر رکھدیا ہے دوسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ قیمت چار آنے ۔ ۔ ۔ (۴ ر)

کُنجِ عافیت

یہ ناول غضب کا دلفریب ہے۔ جس میں ہندوستانی عورت کا بلند ترین چلن دکھا کر اُس کے ساتھ یوروپین عورت کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس ناول کو خود پڑھیئے آپ ہندوستانی ہونے پر فخر کرنے لگینگے۔ اپنی بیوی کو پڑھائیے اُس کی زندگی اور بھی بلند ہو جائے گی۔ **قیمت ۶ ر**

تہذیب کے تازیانے

بنگال کے نامور ناول نویس بابو بنکم چٹرجی کی شہرت اُنکی کتابوں میں ہے، اور اُنہی کتابوں کی روح وہ مضامین ہیں۔ جنکا ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے تہذیب کے تازیانے کے نام سے کر کے اردو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، نقادان ادب کی رائے ہے کہ ایسی کتاب اُردو میں آج تک شائع نہ ہوئی تھی ۱۲/

بنگال کی تیس ۳۲

بنگال کے مشہور قصہ نویس بابو رابندر ناتھ ٹیگور، پربھات کمار۔ ستیا دیوی۔ شانتا دیوی۔ نروپما دیوی۔ جلدھر سین۔ شرت چندر۔ سورن کماری وغیرہ وغیرہ قابل قدر ہستیوں کے تبیس افسانے قیمت حصہ اول (عہ) حصہ دوم ۱۲/ +

بیگناہ مجرم

اس ناول میں فطرت نگار سدرشن نے فرانسیسی اور بنگالی انشاپردازی کو یکجا کر دیا ہے۔ اور اسپر طرہ یہ کہ اُردو ادب کی شان کو میلا نہیں ہونے دیا۔ ایسا پُر اثر، ایسا پُر لطف اور ایسا پُر سبق ناول آپنے آجتک نہ دیکھا ہوگا دو اڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب تیسرا شائع ہُوا ہے۔ قیمت عہ

صبح وطن

حُب وطن کے قصے، جان فروشی کی کہانیاں بہادری اور دلیری کے زندہ واقعات کاغذ کے سٹیج پر۔ یہ اُن سورماؤں کی کہانیاں ہیں۔ جو شہرت کے پلیٹ فارم پر آئے بغیر ملک کے لئے شہید ہوئے یہ اُن سربکف دلاوروں کے افسانے ہیں۔ جنہوں نے اپنا متاع دل تاریکی وطن پر نثار کیا۔ دوسرا اڈیشن ختم ہونیوالا ہے۔ قیمت عہ

آنریری مجسٹریٹ

یہ مذاقیہ ڈراموں کا شہنشاہ ہے اعلان کر دو۔ کہ ہندوستان کی کسی زبان میں بھی ایسا تفریحی ڈراما آجتک نہیں شائع ہُوا۔ ایک ایک فقرہ قہقہوں سے بھرا ہے۔ فرانس کے مشہور ناٹک نویس مولیئر کے بہترین ڈراما کے مقابلہ کا ہے۔ قیمت ۸/

من کی موج

یہ کتاب "چُٹکیاں" کی بہن ہے۔ وہی رنگ، وہی انداز، وہی طرز، وہی ادا پیرایہ ایسا مذاقیہ کہ آپ پڑھکر لوٹ جائیں مگر نتائج ایسے سنجیدہ کہ آپ دل پکڑ لیں اور مصنف کی قابلیت پر عش عش کر اُٹھیں۔ پہلے اڈیشن میں ۹۶ صفحے تھے اور قیمت ۸، اب حجم بڑھا کر ۱۴۴ صفحے کر دیا گیا ہے قیمت ۱۲/

عورت کی محبت

عورت کی محبت اور پھر بنگالی عورت کی۔ اور خاصکر اُس صورت میں جبکہ اُسکا لکھنے والا بنگال کا نہیں بلکہ موجودہ ایشیا کا شیکسپیئر ڈی۔ ایل رائے ہے اور اُسے ترجمہ فطرت نگار سُدرشن نے کیا ہو۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ قیمت عہ

سدابہار پھول

اس کتاب میں فطرت نگار سُدرشن کی اٹھارہ ۱۸ کہانیاں ہیں۔ ان کا پلاٹ بیحد دلچسپ ہے۔ پڑھکر طبیعت خوش ہو جاتی ہے یہ فطرت نگار کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ جس نے اُن پر شہرت کا در وا کیا تھا تین اڈیشن ختم ہو چکے ہیں۔ اب چوتھا اڈیشن چھپا ہے قیمت ۱۲/

زہریلا انجبات

مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ایک ہندو سلطنت قائم ہوئی اور پھر ہندو حکمران ہی کی غلطیوں کی بدولت پاش پاش ہو گئی۔ کس طرح؟ یہ پڑھ کر دیکھئے۔ اصل ناول بنگالی زبان میں ہے اور مشہور ناول نویس بابو بنکم چندر چٹر جی کے قلم سے ہے فطرت نگار سُدرشن نے اسے اُردو جامہ پہنایا ہے دوسرا اڈیشن عہ

وجے سنگھ

سوتیلی ماں کیا کچھ کر سکتی ہے باپ محبت پدری کے جوش میں کس طرح دیوانہ ہو جاتا ہے۔ عالم شباب میں حُسن و عشق کیا کیا رنگ بدلتے ہیں یہ سب کچھ اس کتاب میں دیکھئے۔ انسانی فطرت کا ایسا صحیح بیان اور کہیں نہ ملیگا۔ قیمت عہ

گلدستہ سخن

اگر آپکو اُردو زبان کے شاعروں کی بہترین نظموں کا انتخاب دیکھنا ہو تو یہ کتاب دیکھئے۔ اگر آپکو مولنٰنا حالی۔ حضرت آزاد۔ ڈاکٹر اقبال سرور۔ چکبست۔ محروم۔ ارشد۔ وفا۔ مہر۔ نیرنگ۔ ناظر۔ نادر۔ برق۔ افق کی کلام زندہ جاوید سے فائدہ اُٹھانا ہو۔ تو یہ کتاب دیکھئے۔ شروع میں اُردو شاعری کی تاریخ پر ۴۸ صفحے کا ایک پُر زور دیباچہ بھی ہے۔ قیمت (عہ) سُنہری ریشمی جلد (عہ)

ملنے کا پتہ: **منیجر رام کُٹیا بُک ڈپو۔ لاہور**

کلکتہ کے نامی ڈاکٹر ایس کے برمن کا

۱۹۲۶ء کی "تحفہ" کافوری جنتری

امسال ہر خاص و عام کے دلچسپ و کارآمد بنانے کی غرض سے مزید اضافہ کے ساتھ اعلےٰ درجہ کے چکنے کاغذ پر چھپی ہے۔ شائقین کی درخواست آنے پر مفت ارسال خدمت کیجاتی ہے۔

مقوی گولیاں

(ڈھیلے جوان اور گئے گزرے بوڑھوں کے لئے ایک اعلےٰ سہارا ہے)

طاقت بخش ادویہ میں مشہور دوائیں فاسفورس اسٹرکنیا دامیانا وغیرہ اجزا سے یہ گولیاں بنی ہیں۔ جسم کے مادوں میں ریڑھ رگ و ریشہ خون کو باقاعدہ کرنے کے لئے یہ گولیاں خاص دعوےٰ رکھتی ہیں۔ اس کے استعمال سے کمزوری وغیرہ امراض مردانہ اور جوانی میں ضعیفوں کے مانند ناتوانی وغیرہ شکایات دفع ہو کر جسم طاقتور ہو جاتا ہے قیمت دو ہفتہ کی دوا ۳۰ گولیوں کی فی شیشی عہ ایک روپیہ چار آنہ۔ محصولڈاک ایک سے چار شیشی تک ۶ر چھ آنہ

دمہ دم کے ساتھ ہے۔ یہ بات صریح غلط ہے

کیونکہ ڈاکٹر صاحب برمن کا ایجاد کردہ دمہ کی دوا عرصہ ۲۴ سال سے ہندوستان کے ہر حصّہ میں شہرت کیساتھ مفید ثابت ہوئی ہے۔ لاکھوں مریض ہر سال شفا پا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مریض دمہ کو لاعلاج سمجھ کر عمر غیر طبعی میں مارے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی کیمیائی اصول کی بنی ہوئی **دمہ** کی دوا کے ایک ہی خوراک سے دمہ دب جاتا ہے۔ اور چند روز کے استعمال سے دمہ کا دورہ موقوف ہو کر جڑ سے نابود ہوتا ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) محصولڈاک چھ آنہ ۶ر۔ **نوٹ**:۔ ہماری ادویات ہر جگہ ایجنٹ یا دوا فروشوں کے پاس ملتی ہیں۔ فرمائش سے پہلے اپنے مقامی دوافروش اور دکانداروں سے دریافت کیجئے۔

المشتہر

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۴ تاراچند دت اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ:۔ مینجر صاحب پیسہ اخبار لاہور